Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1971

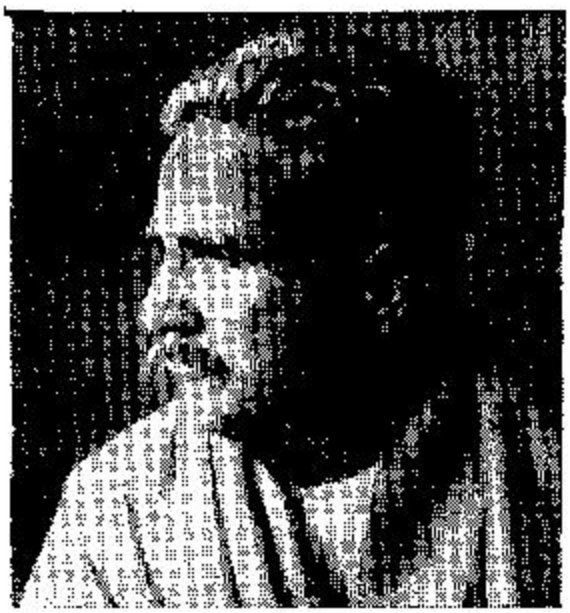

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور ۹

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۰۸۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ لاہور

بدل اشتراک
پاکستان
سالانہ ــــــ دس روپے
غیر ممالک
سالانہ ــــــ ایک پونڈ

جلد (۲۴)
اپریل ۱۹۷۱ء
نمبر (۴)

فہرست

(۱) لمعات ــــــ ۲
(۲) درِ منثور ــــــ ۲۸
(۳) معرکۂ دین و وطن ــــ (علامہ اقبالؒ) ــــ ۳۳
(۴) بابُ المراسلات ــــ (کیا طالب علموں کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے) ــــ ۴۵
(۵) اسلامی ریاست میں زمین کی ملکیت ــــ (شاہد عادل) ــــ ۴۹
(۶) حقائق و عبر ــــ (یہ کس قسم کی مخلوق ہے) ــــ (ٹیلیویژن کے اسلامی پروگرام) ــــ ۶۳
(۷) تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف ــــ (محترم محمد اسلام صاحب) ــــ ۶۵
(۸) چند نکات ــــ پانچ سال پہلے ــــ ۷۶

ایڈیٹر، محمد خلیل - ناشر، سراج الحق - مقام اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ لاہور - پرنٹر، شیخ محمد اشرف - مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ - لاہور

مسلّح افواجِ پاکستان — پائندہ باد!

قائداعظمؒ

پاکستان کو اپنی مسلّح افواج پر کامل اعتماد ہے اور اسی اعتماد کی بنا پر اسے اپنی حفاظت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہے۔

پاکستان کے پاسبانو! تم اپنی اس عظیم مملکت کے شایانِ شان ثابت ہونا۔ اہلِ پاکستان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے محافظ تمہیں ہو اور اس اعتبار سے تمہارے سر پر بہت بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں جب کبھی اپنے ملک کی مدافعت اور قوم کی حفاظت کے لئے آواز دی جائے گی، تم اپنی شاندار روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس پر لبیک کہو گے۔ تم پاکستان کے جھنڈے کو ہمیشہ بلند اور اس کی عظمت اور وقار کو قائم اور دائم رکھو گے کہ یہ درحقیقت تمہاری قوم کی عظمت اور وقار کا نشان ہے۔ (۱۹۴۸ء)

صدرِ مملکت، آغا محمد یحییٰ خان

آخر میں میں اس بات کو بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، جب تک میں پاکستان کی مسلّح افواج اور مملکت کا سربراہ ہوں، میں پاکستان کی مکمل اور مطلق سالمیت کو برقرار رکھوں گا۔ اس معاملہ میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے کروڑوں شہریوں کی طرف سے مجھ پر اس ملک کو قائم رکھنے کا فرض عاید ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے اس کی توقع رکھتے ہیں اور میں انہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں چند افراد کو اس امر کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ کروڑوں بے گناہ پاکستانیوں کے وطن کو برباد کر دیں۔ پاکستان کی سالمیت، استحکام اور سلامتی کو برقرار رکھنا مسلّح افواجِ پاکستان کا فرض ہے جس میں وہ کبھی ناکام نہیں ہوئی ہیں۔

(۲۶ مارچ کی ریڈیائی تقریر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا (۲۹/۹۲)

دیکھنا! کہیں تمہاری حالت اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے سارا دن بڑی محنت سے سوت کاتا اور شام کو اُسے خود اپنے ہاتھوں سے بکھیر دیا۔

اس وقت پاکستان بیم ورجا کے جس دوراہے پر کھڑا ہے، کون سا قلب ہے جو اس کے عواقب کے احساس سے لرزاں و ترساں، اور کونسی چشم بینا ہے جو اس کے مآل کے تصور سے گریاں و خونناب فشاں نہیں۔ اگر کسی کو اپنے ایک گھر کے لٹنے کا خطرہ ہو تو اس کے احساس سے اس پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے لیکن جہاں ایک مملکت کے اجڑنے اور تباہ ہو جانے کا امکان نظر آتا ہو، اس سے قوم پر جو حشر برپا ہو سکتا ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے ۔۔۔ اور پھر سوال صرف ایک مملکت کے تباہ و برباد ہو جانے ہی کا نہ ہو، سوال یہ ہو کہ اس کے بعد اس مملکت کی موجودہ اور آنے والی نسلوں پر کیا گزرے گی۔ مملکتِ پاکستان کے اجڑنے یا کمزور ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بدنصیب باشندوں کو ہندو کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرنا ہوگی ۔۔۔ اس ہندو کے رحم وکرم پر جس کی سفاہت اور دنائیت کا یہ عالم ہے کہ تقسیم ہند کے بعد وہاں بیشتر ایسے مسلمان رہ گئے جنہوں نے تحریک کے دوران مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی اور ہندو کا ساتھ دیا تھا، گزشتہ تیئیس سال میں ہندو نے جو کچھ ان مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے اس سے ان بیچاروں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ اب سوچئے کہ جن مسلمانوں نے، ہندو کی مخالفتوں کے علی الرغم پاکستان کی تشکیل کرلی اور اس کے بعد ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ان کے تمام ارادے خاک میں ملا دیئے، اگر (خدا نکردہ، صد بار خدا نکردہ) یہ مسلمان ان کی گرفت میں آگئے تو ان کا حشر کیا ہوگا؟ اس وقت پاکستان جس دوراہے پر کھڑا ہے وہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تو اس کا فطری نتیجہ یہی ہوگا

کہ یہ مملکت بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندو کی گرفت میں چلی جائے گی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔ یٰلَیۡتَنِیۡ مِتُّ قَبۡلَ ھٰذَا وَکُنۡتُ نَسۡیًا مَّنۡسِیًّا۔

جب ہم موجودہ بحران کے اسباب و عوامل کی تلاش میں نکلتے ہیں تو سطح بین نگاہیں ماضی قریب کے بعض واقعات پر جا کر رک جاتی ہیں اور سمجھ بیٹھتی ہیں کہ اس کے ذمہ دار یہی ہیں۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ گزشتہ انتخابات کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ نے جو اکثریت حاصل کر لی تو اس کی بنا پر اس کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن نے نشۂ پندار میں بدمست ہو کر آمرانہ انداز اختیار کر لیا۔ دوسری طرف سے کہا جاتا ہے کہ آئین سازی کا مسئلہ، مسٹر مجیب اور صدر مملکت کے (ی. م. ن) کا تھا، مسٹر بھٹو خواہ مخواہ دخل انداز ہو گئے۔ کوئی کہتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حکومت کی طرف سے چند تدبیری غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ یہ بحران نہ ان تازہ واقعات کا پیدا کردہ ہے اور نہ ہی اس کے اسباب و علل اتنے سطحی ہیں۔ اس کا سلسلہ بہت پیچھے چلا جاتا ہے۔ اتنا پیچھے کہ اس کی ابتدا خود پاکستان کے یومِ آغاز سے ہو گئی تھی۔

پاکستان اگست ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا اور ۱۹۴۸ء کے آغاز میں مشرقی پاکستان میں (جسے اس زمانے میں مشرقی بنگال کہا جاتا تھا) "زبان کے اختلاف" کی آڑ میں فسادات شروع ہو گئے اور حالات ایسی نزاکت اختیار کر گئے کہ خود قائد اعظمؒ کو وہاں جانا پڑا۔ وہ قریب نو دن وہاں ٹھہرے۔ واپسی پر انہوں نے، وہاں کے رہنے والوں کے نام ریڈیو سے ایک الوداعی پیغام نشر کیا جس کے دوران فرمایا۔

"پاکستان مسلم قومیت کی وحدت کا مظہر ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ ہمیں حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس وحدت کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم نے اپنے آپ کو اوّلاً بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ کی حیثیت سے سمجھنا شروع کر دیا، اور مسلمان اور پاکستان ہونے کی حیثیت محض اتفاقیہ تصوّر کر لی گئی تو پھر پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے یہ نہ سمجھئے کہ یہ کوئی بعید از قیاس اور ناقابلِ فہم سا مسئلہ ہے۔ ہمارے دشمنوں کو اس کے امکان کا اچھی طرح اندازہ ہے اور انہوں نے ابھی سے اس کے لئے بساط بچھانی شروع کر دی ہے۔ میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا سوچئے کہ جب سیاسی ایجنسیاں اور ہندو پریس، جس نے تشکیلِ پاکستان کی انتہائی مخالفت کی تھی، مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے مزعومہ "منصفانہ حقوق" کا درد دل میں لے کر اٹھیں تو کیا یہ ایک انتہائی شر انگیز چال نہیں ہو گی؟ کیا اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے نہیں آ جاتی کہ یہ عناصر تخلیقِ پاکستان کی مخالفت کی مہم میں ناکام رہ گئے، تو اب انہوں نے اس کے اندر انتشار پیدا کر کے اسے ختم کرنے کی ٹھان لی ہے اور اس کے لئے ایسا شر انگیز پراپیگنڈہ شروع کر دیا ہے جس سے ایک مسلمان بھائی دوسرے بھائی کے خلاف لڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔"

آپ نے غور فرمایا کہ قائد اعظمؒ نے جس "گہری چال" کی نشاندہی کی تھی وہ کیا تھی؟ یہ کہ بھائی کو بھائی کے ساتھ

لڑایا جائے" اور اس طرح پاکستان کے مغربی اور مشرقی بازوؤں میں اس قدر اختلافات بڑھا دیئے جائیں کہ وہ ایک دن، ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ اس سازش کی آگ کبھی کبھی بھڑک کر شعلوں کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور اس کے بعد پھر زیرِ خاکستر سلگتی رہتی تھی۔ اس دوران میں یہ سازش وہاں کن کن شکلوں میں نمودار ہوتی رہی؛ اور مشرق اور مغرب کے بازوؤں میں تفریق بلکہ نفرت کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی گئی، اس تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں۔ ہم اتنے سالوں کی مسافت کو عبور کر کے، اس مرحلہ پر آ جاتے ہیں جہاں یہ آتشِ خاموش ملک گیر شعلہ بن کر سامنے آ گئی۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے مولانا بھاشانی نے کہا تھا کہ ان کے پاس کچھ دستاویزات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکی سیاست، مشرقی پاکستان کو ایک آزاد مملکت بنانے کی سازش میں مصروف ہے اور انہوں نے وہ دستاویزات (یا ان کی نقول) حکومت کو بھیجدی ہیں۔ اس کے بعد ان دستاویزات کے متعلق کچھ سنائی نہ دیا تو گزشتہ فروری میں پاکستان ٹائمز میں ایک خط شائع ہوا جس میں ان کے متعلق استفسار کیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں محمد عباس علی صاحب نے (پاکستان ٹائمز کی ۴ مارچ کی اشاعت میں) ایک خط شائع کیا کہ مذکورہ بالا دستاویزات ان کے قبضہ میں بھی ہیں، اور انہوں نے انہیں، اور ان کے علاوہ کچھ اور متعلقہ دستاویزات کو اپنی کتاب (SALVATION OF EAST PAKISTAN) میں درج کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے مکتوب میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ دستاویزات ڈھاکہ اور کلکتہ میں، بیک وقت، ایک ہی دن، ایک مخصوص حلقہ میں تقسیم کی گئی تھیں اور حسنِ اتفاق سے ان کے ہاتھ بھی آ گئی تھیں۔ ان کی یہ کتاب اس وقت ہمارے سامنے ہے اور اس میں اس سازش پر سے بڑی عمدگی سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جولائی ۱۹۶۲ء میں مشرقی بنگال میں، بنگالی زبان میں بہت سے اشتہارات تقسیم کئے گئے۔ ان میں سے ایک کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے۔

"ہم مشرقی پاکستان کے سیاستدان، دیگر سیاستدانوں، مغربی بنگال کے باشندوں اور ہندوستان کے دوسرے مشرقی خطوں سے اپیل کریں گے کہ وہ اپنی خود مختاری کے لئے ایک تحریک شروع کر دیں جس کا مقصد یہ ہو کہ ہم اپنی متحدہ قوتوں سے آزاد بنگال کی مملکت قائم کر لیں ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی تمام کوششوں کو، اس آزاد مملکت کی تشکیل کے لئے وقف کر دیں۔ اس سلسلے میں ہم میزو اور ناگا لیڈروں سے بھی اپیل کریں گے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہماری جدوجہد میں ہمارا ساتھ دیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ تمام بنگالی آزاد ہو جائیں اور اپنے اقتدارِ اعلیٰ کے حق کو عملی شکل دے دیں۔ اس جدید بنگالی مملکت کا دارالخلافہ کلکتہ کا قدیم شہر ہونا چاہیئے۔ اس مملکت کا نام "ریاستہائے متحدہ بنگال" ہو گا۔ ہمارے اتحاد کی بنیاد یں زبان، جغرافیہ اور تاریخ کے اشتراک پر ہیں۔ مذہب کو ہمارے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہیئے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ بنگال، آسام، ناگا لینڈ، تری پورہ، منی پورہ، سکم اور بھوٹان کے نمائندوں کا ایک اجلاس

بلایا جائے جس میں مشترکہ اقدامات کا پروگرام طے کیا جائے اور ایک مجلس انتظامیہ قائم کی جائے جو آزاد بنگال کے قیام کی جدوجہد کے سلسلہ میں ضروری ہدایات دیتا رہے۔"

اس کے بعد دسمبر ۱۹۶۶ء میں وہ بلیٹن شائع ہوا جس کے متعلق محترم عباس صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ ڈھاکہ اور کلکتہ کے مختص حلقہ میں بیک وقت تقسیم کیا گیا۔ یہ بلیٹن اعلیٰ درجہ کے گلیزڈ کاغذ پر چھپا ہوا تھا، اور ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ وہ مغربی جرمنی میں طبع ہوا ہے۔ بلیٹن کے سرعنوان یہ عبارت تھی۔

AGENCIA INTERNATIONAL DE PRENSA

INTERNATIONAL PRESS SERIVE (TP)

AGENCE DE PRESS INTERNATIONAL

A6/975-E-1 KL 7.12.1966

اس کے نیچے جو عبارت تھی اس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"مشرقی پاکستان کے اضطراب انگیز حالات ایک بہت بڑے خطرہ کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے باشندے دو مختلف نسلوں سے متعلق ہیں جن میں مذہب کے سوا کوئی اور قدر مشترک نہیں۔ مشرقی پاکستان کے لئے خود مختاری کا مطالبہ محض ایک سیاسی نعرہ نہیں جسے ایوب خان کے مخالفوں نے وضع کیا ہے۔ یہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کے دل کی آواز ہے اور تاریخی طور پر ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ مشرقی پاکستان کی آبادی، پاکستان کی کل آبادی کے نصف سے بھی زیادہ ہے لیکن حالت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی حکومت اور فوج، دونوں پر کنٹرول مغربی پاکستان کا ہے۔ اس سے مشرقی پاکستان کے باشندوں کے دل میں عدم اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے، اور ان کا یہ مطالبہ کہ انہیں آزادی حاصل ہونی چاہیئے، دن بدن شدید ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے ایوب خان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ اس کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں کے باشندوں کے اس مطالبہ کا مقابلہ کر سکے۔

(علاوہ بریں) ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں جو صورت حالات پیدا ہو رہی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ دہلی کی حکومت ان کے مفادات سے بھی بے اعتنائی برت رہی ہے۔ انہیں وہاں سے بھوک اور افلاس کے سوا کچھ نہیں ملتا جب ... مغربی بنگال میں قحط نے تباہی مچائی تھی تو اس کے خلاف مظاہرین نے خود ساختہ دستی بموں تک کا استعمال کیا تھا اس صوبہ میں ابھی تک بدنظمی جاری ہے جسے پولیس اور فوج تشدد سے دبانا چاہتی ہے۔ اگرتلہ کے قصبہ میں مظاہرین کے ایک ہجوم نے سنٹرل انٹیلیجنس آفس کے ہیڈکوارٹرز پر ہلہ بول دیا۔ پولیس کی ایک گاڑی کو آگ لگا دی اور ٹیلی فون ایکسچینج کو تباہ کر دیا۔

مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کے قومی لیڈر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہاں کے باشندوں کو مصائب، افلاس

اور لاقانونیت کے عذاب سے نجات دلانے کا اس کے سوا کوئی طریق نہیں کہ وہ باہمی متحد ہو کر پاکستان اور ہندوستان سے الگ آزاد بنگال کی علیحدہ مملکت قائم کر لیں۔ ان علیحدگی پسند لیڈروں کا خیال ہے کہ تقسیم ہند کے وقت یہ بات کتنی ہی معقول اور منطقی کیوں نہ نظر آتی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ایک تاریخی غلطی تھی جس کا ازالہ ضروری ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بنگال صدیوں سے ایک ہم آہنگ وحدت چلا آرہا تھا۔ اس کی زبان ایک، کلچر ایک، اور دارالخلافہ کلکتہ بھی ایک تھا۔ اسے خواہ مخواہ ۱۹۴۷ء میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

ان علیحدگی پسند عناصر کو امید ہے کہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک، اس مقصد کے حصول کے لئے انہیں ضروری امداد دینگے۔ انہیں یقین ہے کہ آزاد مغربی قوتیں، جنوب مشرقی ایشیا میں ایک آزاد ریاست کے قیام میں بڑی دلچسپی لیتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ایسی ریاست، اس خطہ کے حالات کو معمول پر لانے اور چین کے خلاف ایک سپر کا کام دینے کے لئے، ضروری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ علیحدگی پسند لیڈر اس امر پر متفق ہیں کہ یہ آزاد بنگالی ریاست جس کا دارالسلطنت کلکتہ ہو، مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال، آسام، ناگا لینڈ، اور تری پورہ اور منی پورہ کے ملحقہ علاقوں اور سکم اور بھوٹان پر مشتمل ہونی چاہیئے۔ ان علاقوں کا مجموعی رقبہ ایک لاکھ ستر ہزار مربع میل سے بھی زیادہ ہے اور آبادی دس کروڑ سے بھی زیادہ جس میں نوّے فیصد کے قریب بنگالی زبان بولتے ہیں۔ گزشتہ مارچ میں عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمٰن نے ان کے پروگرام کا اعلان کر دیا جس کا عنوان تھا۔

چھ نکات — ہمارا حقِ زیست۔

ان میں مشرقی پاکستان کی خود مختاری کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ علیحدگی پسندوں کے نزدیک، مجیب الرحمٰن کا یہ پروگرام، آزاد بنگال ریاست کے قیام کے پلان کی پہلی کڑی ہے۔

مستند مغربی نقادوں کا کہنا ہے کہ اس کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ پاکستان یا ہندوستان کی حکومتیں اس مطالبہ کی مخالفت کریں۔ اس سے ایک طرف ان متعدد مسائل کا حل خود بخود مل جائے گا جو تقسیم ہند کی تخلیق ہیں اور دوسری طرف ہندوستان کے برصغیر کے حالات کو معمول پر لانے کا موجب بن جائے گا۔

آسام کے پہاڑی علاقوں میں بسنے والے میزو اور ناگا قبائل کے لئے اس قسم کے آزاد ملک کا قیام خاص دلچسپی کا موجب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس جدید ملک میں انہیں بھی ایک خطہ مل جائے گا جس میں انہیں خود مختاری حاصل ہوگی۔ چنانچہ ان لیڈروں نے، میزو اور ناگا قبائل کے ان باشندوں کو جو اس وقت ہندوستان اور برما میں رہتے ہیں، اپیل کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ ایک آزاد ناگا لینڈ مملکت کے قیام کی جدوجہد میں متحد ہو جائیں۔

اسی طرح میزو نیشنل فرنٹ لیڈر بھی اس اسکیم کی تائید کرتے ہیں کیونکہ انہیں امید ہے کہ اس سے انہیں بھی ایک ایسا خطۂ زمین مل جائے گا جس میں وہ میزو لینڈ کی خود مختار انتظامیہ متشکل کر سکیں گے۔ اس خطہ میں برما

اور مشرقی پاکستان کے وہ علاقے شامل ہونگے جن میں اس وقت میزو بستے ہیں۔

کرۂ ارض کے اس حصے میں اس قسم کی آزاد مملکت کا قیام آسامی قبائل اور میزو اور ناگا لینڈ کے مسائل کے حل کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے دنیا کے اس گوشے میں مستحکم حالات پیدا ہو جائینگے۔ "

اس بلیٹن (یا اس سے پہلے جس اشتہار کا ذکر کیا گیا ہے اس) کی اشاعت و تقسیم پر حکومت کی طرف سے کیا اقدامات کئے گئے (ہماری معلومات کے مطابق) اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ لٹریچر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے حلقہ میں ضرور تقسیم کیا گیا ہوگا جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ان کی طرف سے بھی اس کی تردید میں کچھ نہیں کہا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن صاحب نے اپنے چھ نکات کو لاہور میں پیش کیا تھا اور طلوع اسلام کی مارچ ۱۹۶۶ء کی اشاعت کے لمعات میں ان پر تنقید کی گئی تھی۔ ہم ان لمعات کو ایک مقالہ کی شکل میں اشاعت حاضرہ میں الگ شائع کر رہے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم اس سلسلہ میں آگے بڑھیں، ایک اہم نکتہ کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم میں مسلمانوں سے تاکیداً کہا گیا ہے کہ:

یاد رکھو! مسلمانوں کے علاوہ کسی اور کو اپنا رازداں نہ بنانا۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ تم ایسی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہو جاؤ جن سے تمہاری قوت ٹوٹ جائے۔ تمہارے خلاف بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کی زبان پر بے اختیار آجاتی ہیں لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا رہتا ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے ..... دیکھو! ایسا کبھی نہ کرنا کہ تم انہیں اپنا دوست بنالو۔ اگر تم ایسا کرو گے بھی تو وہ تمہیں کبھی اپنا دوست نہیں بنائینگے۔ (۳/۱۱۷-۱۱۸)

قرآن کریم کی اس واضح اور سخت تاکید کے باوجود، مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی کیا پوزیشن تھی، اس کا اندازہ عباس صاحب کے درج کردہ دو ایک واقعات سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جب میں، ۱۹۴۹ء میں ایک "پناہ گزیں" (مہاجر) کی حیثیت سے ڈھاکہ پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ میں وہاں کے ڈپٹی ریہیبلی ٹیشن کمشنر کے پاس جاؤں۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب، جن کا نام چیٹرجی تھا، کرسی پر براجمان ہیں۔ انہوں نے میری درخواست پڑھی، بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا، اور کہا کہ ہمارے ہاں پہلے ہی پناہ گزینوں کی بھرمار ہے۔ تم ہندوستان میں ایک اچھی ملازمت پر فائز تھے۔ اسے چھوڑ کر تم خواہ مخواہ ادھر چلے آئے ہو۔ تمہارا یہ طرز عمل بڑا غیر دانشمندانہ ہے۔ اگر تم اب بھی واپس جانا چاہو تو ہم کلکتہ میں اپنے ڈپٹی ہائی کمشنر کی وساطت سے تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔

یہ تھے وہ بزرگوار جو ہندوستان سے لٹے پٹے پناہ گزینوں کو پاکستان میں بسانے کے مقدس فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے ڈھاکہ میں تعینات تھے، اور یہ تھا وہ انداز جس سے وہ اپنے اس فریضہ کو سرانجام دے رہے تھے۔

دوسرا واقعہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ ایک ہندو جس نے وہاں کی ۱۹۶۸-۶۹ء کی انقلابی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا، اور جسے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے زمانے میں، مشکوک حرکات کی بنا پر نظر بند کیا گیا تھا۔ سول ایڈمنسٹریشن نے اسے میونسپلٹی کا وائس چیرمین تعینات کر دیا تھا۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ مشرقی پاکستان کی حکومت کی مشینری میں ہندوؤں کو کس قدر عمل دخل تھا اور وہ ہندو کس قماش کے تھے (اور ہیں)۔ کیا اس کے بعد حکومت پاکستان کا کوئی راز بھی بھارت سے چھپا رہ سکتا ہے؟

۱۹۶۷ء میں مشہور اگرتلہ سازش کیس کے سلسلہ میں، شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھ دیگر افراد کو گرفتار کیا گیا (جن میں فوج سے متعلق افسران بھی تھے)، تو وہاں اس قسم کے اشتہارات شائع کئے گئے جن میں کہا گیا کہ

ہم تیتومیر، شریعت اللہ، سبھاش بوس اور سُوریا سین کی اولاد، اس قسم کے مظالم کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم ایک بنگالی کی جان کے بدلے میں سو پنجابیوں کی جانیں لے لینگے۔ ہم ان کے مظالم کو دبا دینگے اور انقلاب کی ایک نئی تاریخ کی تخلیق کریں گے ..... ہم پنجابیوں کی قبریں کھود دینگے اور اس طرح بنگالی ایک نئی زندگی حاصل کر لینگے۔ لہٰذا ہم بنگالی عوام، طلبا، مزدوروں اور کاشتکاروں سے کہینگے کہ وہ اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے تیار ہو جائیں ...... ہم انہیں جلا دینگے اور اس دیس سے نکال دینگے۔ لہٰذا تم خون بہانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ (دسمبر ۱۹۶۷ء)

اگرتلہ کیس کو جس طرح خارجی دباؤ کے ماتحت، درمیان ہی میں ختم کرایا گیا اور جس انداز سے شیخ مجیب الرحمٰن اور دیگر ملزمان کو رہا کرایا گیا، عدل کی تاریخ میں شاید اس کی مثال نہ مل سکے۔ اس خارجی دباؤ میں خود مغربی پاکستان کے ممتاز طالع آزماؤں نے بھی جو کردار ادا کیا، وہ بھی ناقابل فراموش ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس باب میں صدر ایوب نے بھی بڑی کمزوری دکھائی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ان ملزموں کو ناحق قید و بند میں رکھتے یا انہیں ویسے ہی کوئی سزا دے دیتے۔ اس قسم کے اقدام کی خود ہماری طرف سے سخت مخالفت ہوتی۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ اس باب میں صدر ایوب اس قدر بے بس ہو گئے تھے تو انہیں چاہیئے تھا کہ وہ یہ کہہ کر کرسی صدارت کو چھوڑ دیتے کہ بجائے اس کے کہ میں ضابطہ عدل کی تذلیل کا موجب بنوں، اسے ترجیح دوں گا کہ مملکت کے اقتدار سے الگ ہو جاؤں اور اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی کہیں گے کہ اگر شیخ مجیب الرحمٰن بھی یہ کہتے کہ اس طرح رہا ہونے کے بجائے، میں اسے ترجیح دونگا کہ عدالت اپنی تحقیقات مکمل کر لے اور اگر میں بے گناہ ثابت ہو جاؤں تو پھر مجھے رہا کیا جائے۔ وہ اس طرح رہا ہوتے تو تاریخ میں ان کا مقام کچھ اور ہوتا۔ جب فرعونِ مصر نے حضرت یوسفؑ کے پاس اپنا قاصد یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ تم بڑی صلاحیتوں کے مالک ہو۔ ہم تمہیں رہا کرتے اور اپنا مشیر مقرر کرتے ہیں، تو انہوں نے قاصد کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ تم اپنے آقا سے جا کر کہو کہ میں تو تم خسروانہ کی بنا پر جیل خانے سے باہر نہیں آنا چاہتا۔ تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو یہ کرو کہ میرے معاملہ کی از سر نو عدالتی تحقیقات کراؤ۔

اگر میں بے گناہ ثابت ہو گیا تو پھر باہر آؤں گا ۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا، اور جب حضرت یوسفؑ بے گناہ ثابت ہو گئے تو پھر جیل خانے سے باہر تشریف لائے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسوۂ یوسفی ساری دنیا کے لئے مشعلِ ہدایت قرار پا گیا، لیکن ۔ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔

بہرحال یہ تو ضمنی بات تھی ۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ وہ سازش اندر ہی اندر پکتی رہی، اس کی کامیابی کا راز اسی میں تھا کہ بنگالی اور غیر بنگالی میں جذبۂ نفرت شدید سے شدید تر کیا جائے ۔ سو وہ کیا جاتا رہا۔

تحریکِ پاکستان کے دوران یہ خیال لوگوں کے دل میں بار بار ابھرتا تھا کہ مطلوبہ پاکستان کے دو بازوؤں میں اس قدر بُعدِ مسافت ہے ۔ وہ کونسا رشتہ ہوگا جو ان دونوں اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے، انہیں ایک قوم اور ایک مملکت بنا سکیگا ۔ اس بنیادی سوال کا جواب قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی (۱۹۴۳ء) میں ان الفاظ میں دیا تھا ۔ پہلے انہوں نے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ

> وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں ۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے ۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے ۔

اور اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم قرآن مجید ہے ۔ مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائینگے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی ۔
>
> ایک خدا ، ایک رسول ، ایک کتاب ، ایک اُمت ۔

اس سازش کی محرک قوتوں کو اس کا علم تھا کہ اسلام ہی وہ رشتہ ہے جو بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کو، اور سب کچھ مختلف ہونے کے باوجود، ایک قوم بنا سکتا ہے، اسی لئے ان کی پوری پوری کوشش تھی کہ نئی نسل کے دلوں سے اسلام کی عظمت اور تقدیس ختم ہو جائے ۔ اس میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے، اس کا اندازہ اس ایک خطبے سے لگائیے جو بنگالی روزنامہ ڈینک پاکستان (DAINIK PAKISTAN , DACCA) کی ۷ مئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، اور جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے ۔

وہ سال گزشتہ بنگلہ اکیڈمی میں، بنگالی سالِ نو کی تقریب منائی گئی تھی جس میں ڈاکٹر انعام الحق مہمانِ خصوصی تھے ۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ بنگالی سالِ نو کی آمد کی تقریب منانا، بنگالی قوم کی ایک نمایاں خصوصیت ہے ۔ اس قسم کی تقریب، بنگالی قومیت کے خمیر میں داخل ہے ۔ جو لوگ اس میں کسی قسم کی خرابی دیکھتے ہیں، وہ اپنی آنکھوں پر رنگین چشمہ لگائے ہوتے ہیں ۔

ڈاکٹر انعام الحق نے ان الفاظ سے خالص بنگالیوں کے دلی خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں تشکیلِ پاکستان کے ساتھ، مغرب (یعنی مغربی پاکستان) کی طرف سے جو لہر ہماری طرف آئی تو اس سے ہم نے اپنے بنگالی تشخص کو فراموش کر دیا۔ پنجابیوں، سندھیوں اور بہاریوں کے ساتھ خلا ملا کی وجہ سے ہم اس قدر بیوقوف بن گئے کہ ہم نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ہم اولاً مسلمان ہیں اور اس کے بعد بہاری، پنجابی وغیرہ"۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سامراج ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن آج ہمیں قدرے اطمینان کا سانس لینا چاہیئے کہ ڈاکٹر انعام الحق اور انہی جیسے دوسرے اداروں کی کوشش سے خوابیدہ بنگالیوں میں حرکت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ ہم شری چیتنیا، خود سلام، سبھاش بوس، بیملے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ خالدؓ، طارق، موسےٰ اور علی جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے میں فخر محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ ہم اپنے بچوں کا نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے "بھگوان" کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا — اللہ — کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں (پر ریجھ گئے تھے) اور ناگن اور ٹھاکر جیسے سیدھے سادھے ناموں کو تیاگ بیٹھے تھے) یہ سب ان رنگین چشموں کا نتیجہ ہے جنہیں باہر سے درآمد کیا گیا ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، کچھ عرصہ تک ہمیں، حکومت یا پبلک کی زیر سرپرستی، من حیث القوم، اس تقریب کو منانے کا موقع نہ مل سکا لیکن اب گزشتہ چند سالوں سے ہم اس دن کو بمسرت منا رہے ہیں — اور یہ تقریب، حکومتی اور نیم حکومتی اداروں کی امداد سے قومی حیثیت سے منائی جا رہی ہے۔ ان تقاریب کا نتیجہ ہے کہ ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال کی اس روش کے تتبع میں مغربی پاکستان کے ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں، اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔ اگر ہم اسی طریق سے اپنے دیگر اہل وطن کے خیالات کو بھی متاثر کرتے رہے کہ وہ جغرافیائی اور لسانی قومیت کو اسلامی قومیت پر ترجیح دیں، تو مغرب کی عیسائی قوموں نے ترکوں کی خلافت کو تباہ کر کے جو کچھ حاصل کیا تھا، ہم اس سے بھی زیادہ حاصل کر سکیں گے۔

کیا ڈاکٹر انعام الحق صاحب ہمیں بتائیں گے کہ انہوں نے، ان رنگین چشموں کو توڑنے کے لئے، جنہوں نے ہمیں اپنی قدیم روایات سے بیگانہ بنا دیا تھا، کیا اقدامات کئے ہیں۔ قوم یہ بھی پوچھنا چاہتی ہے کہ کیا ہم اس دن کو اسی طریق سے مناتے رہیں جس طریق سے اسے ہزاروں سال سے منایا جا رہا ہے یا اسے محفل میلاد کی طرح منائیں جسے ایک غیر ملکی آئیڈیالوجی کا معتقد طبقہ مناتا ہے۔"

اور آپ کو معلوم ہے کہ اس خط کے لکھنے والے کون صاحب تھے؟ عزیز الرحمٰن - ایم - اے (فائنل)، ڈھاکہ یونیورسٹی — انا للہ وانا الیہ راجعون — "غیر ملکی خدا" (FOREIGN ALLAH) کے الفاظ سے

ہمیں وہ واقعہ یاد آگیا جسے پرویز صاحب (باصد حسرت ویاس) اکثر دہرایا کرتے ہیں۔ وہ ۱۹۵۵ء میں ڈھاکہ گئے تو میڈیکل کالج کے بنگالی طلباء نے انہیں تقریر کرنے کی دعوت دی۔ ان کے میزبانوں نے انہیں یہ کہہ کر جانے سے روکا کہ وہاں اردو۔ بنگالی زبان کا مسئلہ بڑی شدت اختیار کر چکا ہے اور آپ اردو میں تقریر کریں گے اس لئے اس میں خطرہ کا امکان ہے لیکن طلباء نے یہ بھی منظور کر لیا کہ وہ اردو ہی میں تقریر کریں اور اس طرح انہیں ان کی اس دعوت کو منظور کرنا پڑا۔ جب وہ تقریر کے لئے جانے لگے تو ان کے میزبان کے ایک بنگالی دوست نے ان کے کان میں کہا کہ آپ جائیے تو سہی لیکن ایک بات یاد رکھیئے۔ اگر وہاں رسول اللہ کا بھی ذکر آجائے تو یہ نہ کہہ دیجئے گا کہ وہ بنگالی نہیں تھے ـــ ہم اس ناصح کی بات کو مبالغہ سمجھا کرتے تھے لیکن اب اس کی صحت کا یقین آگیا۔ جو نوجوان اللہ کو (FOREIGN GOD) سمجھتے ہیں، وہ ایک غیر بنگالی رسول پر کس طرح ایمان لا سکتے تھے!

اس سازش نے بات یہاں تک پہنچا دی تھی۔ رفتہ رفتہ سلسلہ آگے بڑھا تو یہ بحث چھیڑ دی گئی کہ ۱۹۴۰ء کے لاہور ریزولیوشن میں (STATE) نہیں بلکہ جمع کا لفظ (STATES) ہے اس لئے پاکستان کو دو الگ الگ خود مختار ریاستوں پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ یہ بحث اخبارات کے کالموں میں (اور وہ بھی خطوط کی شکل میں) چلائی گئی اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اس بحث میں حصہ لینے والے اس کے متعلق کچھ اس طرح گفتگو کرتے تھے گویا تمباکو کی کاشت کا مسئلہ زیر بحث ہے۔ نہ ملک کے دانشوروں کو اور نہ ہی ارباب حکومت کو اس کا احساس تھا کہ یہ گفتگو کھلی ہوئی بغاوت کی غماز ہے ـــ ایک مملکت میں رہتے ہوئے یہ بحث چھیڑ دینا کہ اسے دو آزاد مملکتوں میں تقسیم کر دینا چاہیئے، بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر جب یہ بھی کہا گیا کہ امریکہ چاہتا ہے کہ مشرقی پاکستان کو جداگانہ (AID) دیا کرے، تو اسے بھی محض نظری سا مسئلہ سمجھ لیا گیا اور کسی نے اس کے مضمرات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

اُدھر یہ ہو رہا تھا، اور اِدھر:

(۱) بحالی جمہوریت کا "جہاد" اس شد و مد سے شروع کیا گیا گویا اسلام کی فنا و بقا کا دار و مدار اسی پر تھا، حالانکہ مغربی انداز کی غیر مشروط اور غیر مقید جمہوریت، جس میں اکثریت کا ہر فیصلہ وحی منزل من اللہ کی طرح حق اور واجب التسلیم قرار دیا جاتا ہے، یکسر خلاف اسلام ہے۔ کسی نے اتنا نہ سوچا کہ یہاں جس خطے کو اکثریت حاصل ہے، وہاں پاکستان اور خود اسلام کے خلاف کس قسم کی فضا پیدا ہو چکی ہے اور ان حالات میں غیر مقید جمہوریت کے نتائج کیا ہونگے۔

(۲) پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی جو خود اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اسے یہاں نظر انداز کر دیا گیا جس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں توازن کا پاسنگ وہاں کے قریب ایک کروڑ ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اب جسے اکثریت کا فیصلہ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت انہی ایک کروڑ ہندوؤں کا فیصلہ ہوتا ہے ـــ اور

ان کا جو فیصلہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

(۳) اس عدم توازن کی روک تھام مشرقی اور مغربی پاکستان میں مساوات (PARITY) کے اصول کی رُو سے کی گئی تھی۔ یہ مساوات، ان عناصر پر کس قدر گراں گزر رہی تھی جو وہاں نفرت اور علیحدگی کا بیج بو رہے تھے اور اسکے لئے پاکستان کے یومِ تاسیس سے مسلسل مصروفِ سعی و کاوش تھے، وہ ظاہر ہے۔ "بحالیٔ جمہوریت" کے بعد اس اصولِ مساوات کو ختم کیا گیا اور اس طرح اس بند کو توڑ دیا گیا جو اس سیلاب کو روکے ہوئے تھا۔

(۴) مغربی پاکستان میں بین الصوبجاتی تعصب اور مفادات کی کشمکش کو روکنے کے لئے "وحدت (ONE UNIT) کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اس میں انتظامی اسقام ضرور تھے لیکن بجائے اس کے کہ ان اسقام کو دور کیا جاتا، خود اس اصول ہی کو خیرباد کہہ دیا گیا اور کسی نے اتنا نہ سوچا کہ جس قسم کی مرکز شکن خود مختاری کا مطالبہ مشرقی پاکستان کر رہا ہے، جب اسے اس نے حاصل کر لیا تو اسی قسم کے مطالبات یہاں کے صوبوں کی طرف سے بھی شروع ہو جائینگے اور اس کے بعد جسدِ پاکستان کے اعضاء و جوارح تو باقی رہیں گے، خود جسدِ پاکستان کا سراغ تک کہیں نہیں ملیگا۔

یہ تھے وہ حالات، اور ایسی تھی وہ فضا جس میں شیخ مجیب الرحمٰن چھ نکات کو اپنا منشور قرار دیکر انتخابات کی مہم کے لئے میدان میں آئے۔ حالانکہ یہ منشور، پاکستان کی سالمیت کو مضمحل کر دینے کا اعلان، اور بالآخر اسے بنیادی طور پر ختم کر دینے کے لئے قدمِ اول تھا۔ اس انتخابی مہم میں نفرت کی آگ کو اور بھی زیادہ ہوا دی گئی۔

ان انتخابات کے نتائج پر یہاں کسی نے اس نقطۂ نگاہ سے غور نہ کیا کہ ملک کی سیاست پر ان کا کیا اثر پڑیگا۔ یہاں انتہا ہی ہوا کہ جیتنے والوں نے جشنِ مسرت منائے اور ہارنے والے یہ سوچنے بیٹھ گئے کہ اپنی شکست کا انتقام کس طرح لیا جائے۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں نے جس دقتِ نظر سے ان کا جائزہ لیا، اس سے ایک تو اس امر کا اندازہ لگ سکتا ہے کہ ہمارے وہ بھائی ہمارے معاملات میں کس قدر گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور ان کی نظروں میں پاکستان کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور دوسرے یہ کہ ان کا سیاسی شعور (ہمارے مقابلہ میں) کس قدر بیدار اور ان کی نگاہ کیسی دور رس ہے۔ انگریزی عملداری میں جنوبی ہند کے قلیل التعداد مسلمانوں کی حیثیت کچھ زیادہ مؤثر نہیں تھی اور ہمارا خیال تھا کہ ہندوؤں نے انہیں اس طرح کچل دیا ہوگا کہ ان کی کوئی آواز ہی باقی نہیں رہی ہوگی۔ لیکن جو واقعہ آپ کے سامنے آرہا ہے، اس سے آپ بھی ہماری طرح حیران ہونگے کہ ان کی موجودہ حیثیت اس سے مختلف ہے۔ بنگلور (میسور) سے ایک ہفت روزہ جریدہ شائع ہوتا ہے جس کا نام ہے "نشیمن" اور جس کے مدیر ہیں عثمان اسد ـــــ نہ یہ اخبار ہی کچھ ایسا معروف ہے اور نہ ہی اس کے ایڈیٹر کسی خاص شہرت کے مالک ـــــ ایک تو اسے ذہن میں رکھیئے، اور دوسرے یہ کہ ہمارے انتخابات کے نتائج (مکمل شکل میں) ۱۸ دسمبر کی شام تک سامنے آگئے تھے، اور اس اخبار نے اپنی ۲۰ دسمبر کی اشاعت میں ان پر تبصرہ کیا اور تبصرہ ایسا مفصل کہ اداریہ کے علاوہ قریب دو بھرپور صفحات اس پر مشتمل ہیں۔ یہ تبصرہ

طویل ہے اور ضروری نہیں کہ ہم اس بالکلیہ اتفاق بھی کریں۔ لیکن اس مقصد کے پیشِ نظر کہ ہمیں معلوم ہو کہ ہندوستانی مسلمان ہمارے متعلق کیا سوچتے ہیں، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اسے بتمام و کمال قارئین کے سامنے لایا جائے۔ اسے آپ غور سے دیکھئے۔ اس میں لکھا ہے۔

"جب انگریزوں نے ہندوستان کی تقسیم کی تجویز کو منظور کر لیا تو فرقہ واریت کا ایک بھیانک طوفان ہر طرف اُمڈ کھڑا ہوا اور بنگال و پنجاب کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پڑے۔ جناح نے اس تقسیم کی سخت مخالفت کی اور کہا تھا کہ اگر بنگال تقسیم ہوا تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کو زبردست نقصانات ہونگے۔ اس لئے بنگال کا متحد رہنا ہی بہتر ہے۔ مگر ان کی بات نہیں سنی گئی۔ غرض بنگال تقسیم ہو گیا اور جناح کے لئے مصیبت پیدا ہو گئی۔ وہ جان گئے تھے کہ ۱۶۰۰ میل کی دوری پر واقع کسی علاقے کو کنٹرول میں رکھنا کس قدر دشوار ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ بعض اوقات صوبائی تعصب مذہبی رشتوں پر بھی غالب آجاتا ہے۔ مسلمان سب ایک ہیں مگر مشرقی پاکستان مغرب کے بھائیوں سے مل کر نہیں رہنا چاہتا۔ وہ الگ ہونا چاہتا ہے۔ مجیب الرحمٰن صرف چند معاملات میں آزادی طلب کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ابتدا ہے۔ آگے بہت کچھ طلب کیا جانے والا ہے۔ انکے مطالبات مغربی پاکستان کا کوئی فرد منظور نہیں کرتا اور ان میں جھگڑا یقینی ہے۔ اگر مشرق اور مغرب میں ایسی نوبت آگئی تو ہندوستان اس کے ردِ عمل سے بچ نہیں سکتا۔ اس پر جنگ کے یا دونوں کی دشمنی کے اثرات ضرور پڑیں گے۔ بنگال اور لاہور کی سرحد بے حد حساس ہے اور بالکل کم فاصلے پر واقع ہے۔ غرض کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کو چاہیئے کہ وہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں اختلافات پیدا نہ ہونے دے اور معاملات کو سلجھائے۔ اسی میں اس کی بھلائی ہے۔ یحییٰ خان نے پاکستان میں جمہوریت کی خوشگوار ہوا کو ڈکٹیٹرشپ کی کھڑکی کھول کر اندر آنے تو دیا ہے لیکن اس بات کی کیا گارنٹی کہ وہ اس کھڑکی کو کھلی ہی رکھیں گے، اور جمہوریت کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا کریں گے جس میں ان کی واپسی بھی شامل ہے اور ملکی معاملات میں فوج کا عمل دخل بھی ممنوع قرار پاتا ہے۔ کیا یحییٰ خان یہ الزام اپنے سر لیں گے کہ انہوں نے پاکستان کے ٹکڑے کر دیئے۔ کیا یحییٰ خان ملک کو مجیب الرحمٰن کے حوالے کر دینگے۔ کیا اصغر خان، نصر اللہ خان، فضل القادر چوہدری، ایوب کھوڑو، اور دوسرے جن کو انتخابات میں شکست ہوئی ہے خاموش بیٹھ جائینگے اور انتقامی کارروائی کے طور پر فوجی حکومت کو مضبوط نہیں بنائینگے۔ غرض پاکستان میں آگے چل کر جو کچھ بھی ہونے والا ہے اس کے اثرات ہندوستان پر ضرور پڑینگے اور ہندوستان کو بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے"

اندرا کانگریس کے صدر جگ جیون رام نے پاکستان کے انتخابات کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے خوشی ظاہر کی کہ وہاں آخر کار جمہوری اور ترقی پسند قوتوں کو کامیابی نصیب ہوئی ہے اور اس الیکشن کے اثرات ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالت پر ضرور پڑیں گے۔ مگر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ جگ جیون رام نے اس قسم کی

خوش فہمی کا اظہار اس قدر جلد کیوں کر دیا جبکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان میں جن پارٹیوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے ان میں سے ایک تو ایسی ہے جو ہندوستان کی بدترین مخالف ہے۔ یعنی مغربی پاکستان کی بھٹو کی پیپلز پارٹی۔ الیکشن کے دوران بھٹو نے جتنی بھی تقریریں کیں وہ ہندوستان کے خلاف تھیں۔ انہوں نے پاکستان کو ایٹم بم بنانے کا مشورہ دیا، کشمیر پر چڑھائی کرنے کا مطالبہ کیا۔ ہندوستان پر حملہ کرنے کی باتیں کیں، ہندوستان کے خلاف صف آرائی کرنے کا پلان پیش کیا۔ بھٹو کا ریکارڈ پہلے بھی کچھ کم نہیں تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اپنی تقریروں میں ہندوستان کیخلاف خوب زہر اگلا تھا اور ہندوستان کے سیاست دانوں کو "کتے" کہا تھا۔ اور دھمکی دی تھی کہ پاکستان ہندوستان کیساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کریگا۔ بھٹو جیسے انتہا پسند لیڈر کی کامیابی پر جگ جیون رام نے خوشی کا اظہار کیوں کیا، اس پر ہمیں تعجب ہے۔ اس سے ہٹ کر ۱۹۶۵ء کی جنگ مغربی پاکستان والوں سے ہوئی تھی اور بنگال والوں کا اس میں حصہ نہیں تھا۔ اب اگر مغربی پاکستان میں بھٹو کی پارٹی برسر اقتدار آتی ہے تو اس بات کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے کہ دوستی اور مفاہمت کے مواقع کم ہو گئے ہیں۔ مغربی پاکستان کے لیڈروں کی سیاست اعتدال پسند ہرگز نہ ہوگی۔ پاکستان کے انتخابات نہ صرف پاکستان والوں کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے حیرت انگیز ثابت ہوئے۔ خان عبدالغفار خان کے بیٹے خان ولی خان کی نیشنل عوامی پارٹی کا بہت چرچا تھا اور یہ پارٹی آزاد پختونستان کا نعرے لگا کر کھڑی ہوئی تھی۔ اور مانگ کر رہی تھی کہ پاکستان میں پٹھانوں کے لئے ایک الگ صوبہ بننا چاہیئے۔ لیکن الیکشن میں خود پٹھانوں نے ولی خان کو شکست دے دی اور پختونستان کے مطالبے کو مسترد کر دیا۔ پنجاب میں میاں ممتاز دولتانہ کا بڑا زور تھا اور پنجابی زبان کا نعرہ لگا کر انہوں نے صوبائیت پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر پنجابیوں نے سندھ کے لیڈر بھٹو کو ووٹ دے کر کامیاب بنایا اور دولتانہ کی پارٹی کو ناکام بنا دیا۔ جماعت اسلامی پاکستان کی سب سے منظم اور سب سے طاقت ور جماعت تھی۔ اور دونوں صوبوں میں اس کی ہزاروں شاخیں تھیں۔ مگر اس پارٹی کو حیرت انگیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مغربی پاکستان میں کنونشن مسلم لیگ (ایوب گروپ) کو بھی ایک طاقت ور جماعت کا نام دیا جاتا تھا مگر یہ بھی بری طرح ہار گئی حالانکہ اس کا انتخابی منشور بھی بہت اچھا تھا۔ اب پاکستان میں سوائے عوامی لیگ کے اور پیپلز پارٹی کے کوئی بھی پارٹی قومی پارٹی ہونے کا دعوے نہیں کر سکتی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ بھٹو نے مشرقی پاکستان میں اپنے چند امیدوار کھڑے کئے تھے لیکن ایک بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور مغربی پاکستان میں مجیب الرحمٰن نے بھی چند امیدواروں کو ٹکٹ دیئے تھے مگر سب کے سب ہار گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان دو الگ الگ صوبے بن گئے ہیں اور یہاں کی مقبول پارٹی کو وہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔

مشکلات: مجیب الرحمٰن نے الیکشن کے فوراً بعد کہا کہ میری پارٹی کو پارلیمنٹ میں غالب اکثریت حاصل

ہوئی ہے اور کسی بھی پارٹی کی مدد کے بغیر دستور بھی بنا سکتی ہے اور حکومت بھی بنا سکتی ہے۔ لیکن کیا مغربی پاکستان والوں کو نظر انداز کر کے مجیب الرحمٰن نئی حکومت بنا سکتے ہیں اور ایسی حکومت کو عوام کی تائید حاصل رہے گی اور دنیا ایسی یک طرفہ حکومت کو تسلیم کرے گی۔ کیا مجیب الرحمٰن خود اطمینان کے ساتھ حکومت کر سکیں گے ۔۔ نہیں! پھر مجیب الرحمٰن کو بھٹو کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا۔ مگر کیا بھٹو پنجابیوں اور سندھ والوں کی خواہشات کے خلاف مشرقی پاکستان کو آزادی دینے پر راضی ہو جائیں گے۔ اگر مجیب الرحمٰن نے دوسری پارٹیوں سے تائید حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی مجیب کے چھ نکاتی پروگرام کا ساتھ نہیں دیں گی۔ یعنی پاکستان میں مخلوط حکومت بننے کا امکان ہی نہیں اور کسی ایک پارٹی کی حکومت بن بھی نہیں سکتی۔ شیخ مجیب الرحمٰن ہندوستان سے دوستی چاہتے ہیں اور بھٹو جنگ۔ مجیب الرحمٰن نے بنگالیوں سے کہا ہے کہ لاکھ افراد کو قربان کر کے انہوں نے الیکشن جیتا ہے۔ اگر مشرقی پاکستان کو آزادی و خود مختاری دلانے کے لئے مزید ۱۰ لاکھ کی قربانی دینی پڑے تو اس کے لئے بھی وہ تیار ہیں۔ ایسی باتیں کہنے والا لیڈر اپنے وعدوں سے کبھی ہٹ نہیں سکتا۔ پاکستان کی پہلی منتخب پارلیمنٹ نیا دستور تیار کرے گی اور سب جانتے ہیں کہ یہ مشرقی پاکستان والوں کی خواہشات کے مطابق ہوگا۔ دوسری پارٹیاں نہ صرف اس کی مخالفت کریں گی بلکہ عوام کو بھی اس کے خلاف اکسائیں گی اور پاکستان میں خانہ جنگی کے حالات پیدا ہو کر رہیں گے۔ اگر یحییٰ خان نے دستور منظور نہیں کیا تو مشکل ہے اور کر لیا تو مغرب میں ان کا رہنا مشکل ہے .... پاکستان کے چار ممتاز لیڈروں کو اس وقت بہت مشکلات کا سامنا ہے۔ یحییٰ خان خاموش نہیں رہ سکتے، بھٹو مجیب کے ساتھ مل نہیں سکتے۔ مجیب اپنے وعدوں کو ٹال نہیں سکتے۔ ایوب سیاست میں آ نہیں سکتے اور بھاشانی بغاوت کرا نہیں سکتے۔ ●●

اس عمومی تبصرہ کے بعد اداریہ میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے جستہ جستہ اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"پاکستان میں الیکشن ہو گیا اور اس کے نتائج بھی آ گئے۔ عوام نے فیصلہ کر دیا ہے کہ مغربی پاکستان میں بھٹو کو اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کو برتری حاصل رہے اور یہی دونوں مل کر پاکستان کا نیا دستور بنائیں۔ نیا دستور جو بن رہا ہے اس کی بنیاد کیا ہو گی اور پاکستان کا انجام کیا ہوگا، وہ تو مجیب الرحمٰن کے بیان ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کو مکمل آزادی دی جائے ورنہ عوام پاکستان ہی سے الگ ہو جائیں گے۔ اس کے جواب میں مغربی پاکستان کے بھٹو کیا کریں گے' یہ اب تک معلوم نہ ہو سکا۔ بیچارے بھٹو کر بھی کیا سکتے ہیں ۳۱۳ ممبروں کی اسمبلی میں مجیب الرحمٰن کو اکثریت حاصل ہے۔ وہ جو چاہیں گے وہی ہوگا۔ بھٹو اور دوسرے مل کر لاکھ کوشش بھی کریں' اب پاکستان کا متحد رہنا بہت مشکل ہے۔ مشرقی پاکستان والے جو چاہیں گے وہی ہوگا۔"

اس کے بعد لکھا ہے۔

> اب پاکستان وہ نہیں رہے گا جو پہلے تھا، اس کی طاقت بھی وہ نہیں رہے گی جو پہلے تھی، عوام بھی ایک آواز نہیں ہوں گے۔ صوبائیت پرستی کا طوفان ملک بھر میں پھیل جائے گا۔ اس کے نتائج کیا ہوں گے وہ ایک دو مہینوں میں ظاہر ہو جائیں گے۔

پھر دہرا دیا جاتا ہے کہ یہ تبصرہ ۲۰ دسمبر کے اخبار میں شائع ہوا تھا۔

اس اخبار میں ایک کالم ہے جس کا عنوان ہے "تحیر طراحیں" اور قلم کار ہیں "تحیر بنگلوری"۔ کالم بظاہر مزاحیہ ہے، لیکن اس میں ہمارے منہ پر اتنے زور سے طمانچہ رسید کیا گیا ہے کہ اس کی صدائے بازگشت چار دانگ عالم میں سنائی دے۔ آپ بھی سنیئے اور اپنے گال کو سہلائیے۔ کہا ہے۔

> پاکستان کے انتخابات کے نتائج سنکر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ کیا یہ وہی لوگ تھے جو ہر دن اسلام کے نعرے لگاتے تھے قرآن اور سنت کی باتیں کرتے تھے۔ اور جب وقت آیا تو دونوں کے خلاف جانے میں ذرا برابر جھجک تک محسوس نہیں کی۔ انہوں نے الیکشن کا نعرہ لگایا اور جب الیکشن کرایا گیا تو ثابت کر دیا کہ وہ ایک بن کر رہنا نہیں چاہتے۔ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے وطنیت اور صوبائیت کے جذبات کو مٹا دیا تھا۔ اللہ پر ایمان رکھنے والے اور رسول کا کلمہ پڑھنے والوں کو چاہے وہ کہیں بھی ہوں، ایک بنا دیا تھا۔ زمانی اور مکانی فاصلوں کو اس نے دور کر دیا تھا اور یہ سبق دیا تھا، کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہے۔ لیکن پاکستان والوں نے بتایا کہ وہ ایک نہیں ہیں۔ مشرقی پاکستان والوں کو مغربی پاکستان والوں پر اعتماد نہیں۔ وہ انہیں اپنا بھائی نہیں بلکہ دشمن سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ کسی قیمت پر مل کر رہنا نہیں چاہتے۔ وہ پاکستان کو متحد رکھنا نہیں چاہتے بلکہ صوبوں اور ریاستوں کی بنیاد پر تقسیم کر دینا اور ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ سیاسی شعور رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اگر مشرقی پاکستان والوں کو آزادی اور خود مختاری مل گئی چاہے وہ محدود ہی کیوں نہ ہو تو دوسرے صوبے والے بھی یہی مطالبہ کریں گے اور پوچھیں گے کہ مشرقی پاکستان کو جب آزادی دی جا رہی ہے تو ہمیں کیوں نہیں۔ سرحد والے پختونستان کا، سندھ والے آزاد سندھ کا اور پنجاب والے پنجاب کا مطالبہ کریں گے۔ اس طرح مرکزیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

کیوں؟ جھکتی ہے ہماری گردن شرم سے یا نہیں! یہ انڈیا کا مسلمان، ان پاکستانی مسلمانوں سے کہہ رہا ہے جنہوں نے پاکستان حاصل ہی اس نظریہ قومیت کی بنا پر کیا تھا! یا للعجب۔ واحسرتا!!

اس کے بعد جریدہ مذکور نے کہا ہے کہ

(ضرورت اس امر کی ہے کہ) مجیب الرحمٰن اپنا انتہا پسندانہ رویہ ترک کر کے اعتدال پسندی اختیار کریں اور مفاہمت کے لئے تیار ہوں اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر ایسا دستور بنانے کی کوشش کریں جو صوبوں کو حدود آزادی بھی دے اور مرکز بھی مضبوط ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک ایسا ہی کرے اور پاکستان میں کوئی خطرناک حالت پیدا نہ ہو۔

ہم ان الفاظ کو با چشم نم درج کر رہے ہیں۔ واضح ہے کہ ہمارے لئے یہ دعائیں، انتخابات کی شام کو کی جا رہی تھیں جب ہم یہاں جشنِ مسرت منا رہے تھے۔

(۲)

اس زہرہ گداز اور جگر سوز داستان کے بعد ہم موجودہ بحران کی طرف آتے ہیں۔ (جیسا کہ ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا) اصولِ جمہوریت کی رُو سے عوامی لیگ اور اس کے سربراہ کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ جس قسم کا آئین چاہے ملک پر ٹھونس دے۔ مغربی جمہوریت کی بنیادی لعنت یہی ہے کہ اس کی رُو سے اکثریت کا لیڈر، ان لوگوں کا بھی نمائندہ قرار پا جاتا ہے جنہوں نے (ابھی ابھی الیکشن میں) اس کی سخت مخالفت کی تھی جو اس کے منشور کی دھجیاں بکھیر رہے تھے۔ جو اسے وطن دشمن اور ملت فروش اور نہ جانے کیا کیا قرار دے رہے تھے۔ اگر کوئی حکمران، عوام کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ کرے، تو اسے "ڈکٹیٹر" کہا جاتا ہے اور اس کے خلاف "بحالیٔ جمہوریت" کا جہاد شروع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اکثریت پارٹی کا لیڈر اس قسم کے جی چاہے فیصلے کرے، ملک کی باقیماندہ آبادی کو ان فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اور دنیا کی کسی عدالت میں ان کے خلاف فریاد نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ قانوناً ایسا کر سکتا ہے۔ اس کے خلاف عدالت کا دروازہ اسی صورت میں کھٹکھٹایا جا سکتا ہے جب وہ فیصلہ، مملکت کے آئین کے خلاف ہو لیکن جب خود آئین سازی کے اختیارات بھی اسی کو سونپ دیئے جائیں، تو پھر اس کے خلاف آہ و فغاں کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ سکتی۔

عام حالات میں، اکثریت اور اقلیت کا نتیجہ اتنا ہی ہوتا ہے کہ دو پارٹیوں میں سیاسی رقابت پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہاں جو فضا پیدا ہو چکی ہے اس کی وجہ سے صورت کچھ ایسی سامنے آئی ہے جیسے دو مخالف ملکوں میں میدانِ کارزار گرم ہو گیا ہو۔ بدقسمتی سے اس باب میں شیخ مجیب الرحمٰن نے اس کشادہ ظرفی اور وسعتِ قلبی کا ثبوت نہ دیا جو ان کے مقام کا تقاضا تھا۔ انہوں نے ایک بزرگ خاندان کے بجائے سوتیلی ماں کا سا رول اختیار کر لیا۔ یہ ان کے شایانِ شان نہیں تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ وہ بحران تھا جس سے (ہماری انتہائی بدنصیبی سے) ملک دوچار ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مشرقی پاکستان میں یہ فضا الیکشن کے نتائج کے بعد پیدا ہوئی ہے اس لئے اس کا اندازہ پہلے سے نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ گزشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے زائد اس کے علاوہ اسی قسم کے دیگر شواہد سے)

یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ فضا گزشتہ تئیس سال سے مسلسل اور متواتر چلی آرہی تھی۔ اگر اس حقیقت سے چشم پوشی کر لی جائے تو یہ عذر کسی صورت میں قابلِ پذیرائی قرار نہیں پاسکتا ۔۔۔ اس فضا کے پیدا کرنے کے ذمہ دار، وہ تمام ارباب حل وعقد ہیں جو گزشتہ تئیس سال سے، پاکستان کی سیاست یا اقتدار سے، بالواسطہ یا بلاواسطہ متعلق رہے ہیں۔ ان کے سامنے یہ لاوا پک رہا تھا اور وہ نہایت اطمینان کی نیند سو رہے تھے ۔۔۔ کوہِ آتش فشاں پھٹتا تو کسی ایک دن ہی کو ہے لیکن اس کا لاوا تو ایک دن میں تیار نہیں ہوتا ۔۔۔ یہ ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہوا ہے۔ یہاں، نہ تو مشرقی پاکستان میں اس گہری سازش کی روک تھام کے لئے کوئی موثر قدم اٹھایا گیا اور نہ ہی، مشرق اور مغرب میں حقیقی مواخات پیدا کرنے، اور یہاں اور وہاں کے مسلمانوں کو اسلامی نظریۂ قومیت کی بنا پر ملّتِ واحدہ کے قالب میں ڈھالنے کے لئے دلسوزی اور دلجمعی کے ساتھ کوئی تدابیر اختیار کی گئیں۔ جو کچھ کیا گیا اس کی حقیقت ملمع سازی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ ذمہ دار عناصر کی طرف سے اس مجرمانہ تغافل کے نتیجہ میں، وہاں کی نئی نسل کا اسلام کے خلاف جو ردِعمل ہے اس کا اندازہ اس خط سے بھی لگ سکتا ہے جسے ہم گزشتہ صفحات میں درج کر آئے ہیں۔ نیز ڈھاکہ کے ہفتہ وار جریدہ (FORUM) سے بھی جس کا ایک اقتباس، طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں شائع کیا گیا تھا، اسی اخبار کی ۲۷ فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہ مشرقی پاکستان کی خود مختاری کے بعد، مغربی پاکستان میں کیا صورت سامنے آئے گی، لکھا ہے کہ

> اس کے بعد ون یونٹ تو واپس آ ہی نہیں سکیگا۔ وہ ہمیشہ کے لئے گیا۔ پیپلز پارٹی کا کہنا ہے کہ ایک مضبوط مرکز اور اسلامی نظریۂ حیات، آزاد مغربی پاکستان کو زندہ اور یکجا رکھ سکیگا۔ اس کا یہ خیال خام ہے۔ (نظریۂ پاکستان) جب مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو باہمدگر متحد رکھنے کی بنیاد نہیں بن سکا تو وہ مغربی پاکستان میں بنائے وحدت کس طرح بن سکیگا۔ اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی مشترکہ تاریخ وہ بندھن ہے جس سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمان متحد ہیں۔ ان میں اسلام سب سے کمزور کڑی تھی۔ اس لئے کہ اگر اسلام رشتۂ وحدت بننے کے قابل ہوتا تو پاکستان (اور افغانستان) کم از کم ایک دوسرے کے دوست تو ہوتے۔ جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد نہیں رکھ سکے تو پھر سوچئے کہ بلوچ، پٹھان، پنجابیوں کو کون سا رشتہ متحد رکھ سکیگا! اسلام کی یاد تو یقیناً ایسا نہیں کر سکیگی۔

یہ ہے ہماری موجودہ نسل کے نزدیک اس بندھن (اسلام) کی حیثیت جس کے متعلق قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ وہ ہم میں رشتۂ اخوت قائم کرنے کے لئے بنیانِ مرصوص بنے گا۔

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ الیکشن کے نتائج کے بعد، شیخ مجیب الرحمٰن اس افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے

کہ وہ پورے پاکستان کے نمائندہ اور اس کے مستقبل کے لئے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مغربی جمہوریت کے اصول کی رُو سے وہ ملک کی اکثریت پارٹی کے لیڈر بن گئے تھے اور اس اعتبار سے انہیں پاکستان کے نمائندہ کہلانے کا حق پہنچتا تھا۔ لیکن واقعاتی طور پر ایسا نہیں تھا۔ انہیں مغربی پاکستان سے ایک نشست بھی حاصل نہیں ہوئی تھی اور وہ خود بار بار دہراتے تھے کہ وہ اب مغربی پاکستان سے انتقام لیں گے۔ سوچئے کہ جو پارٹی یا لیڈر کسی ملک سے انتقام لینے کا اعلان کر رہا ہو' وہ اس کا نمائندہ کس طرح قرار پا سکتا ہے؟ جیسا کہ ہم ابھی ابھی کہہ چکے ہیں' اگر وہ فی الواقعہ سارے ملک کے نمائندہ قرار بھی پا چکے تھے تو انہیں چاہیئے تھا کہ اپنے طرزِ عمل سے ایسا ثابت کرتے کہ وہ فی الواقعہ سارے ملک کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے ملک کا نمائندہ قرار پائے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ انہوں نے جو تأثر دیا وہ اس کے بالکل خلاف تھا۔ اگر واقعات کی روشنی میں دیکھئے تو پورا پاکستان تو ایک طرف' عوامی لیگ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی بھی نمائندہ نہیں کہلا سکتی۔ وہاں قریب ایک کروڑ ہندو آباد ہیں' اور مبصرین کا کہنا ہے کہ ان سب کے ووٹ عوامی لیگ کے حق میں گئے تھے۔ اس لئے عوامی لیگ کی اکثریت' ان ہندوؤں کی رہینِ منت ہے۔

یہی نہیں' بلکہ مغربی پاکستان کے مقابلہ میں مشرقی پاکستان کی آبادی کی اکثریت بھی انہی ہندوؤں کی مرہونِ کرم ہے۔ اس سلسلہ میں جب حقائق (اعداد و شمار) سامنے آتے ہیں تو آبادی کی بنا پر اکثریت کا خیال بھی افسانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ سابقہ انتخابات' ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رُو سے انعقاد پذیر ہوئے تھے۔ اس مردم شماری کے مطابق صورتِ حال یہ تھی:۔

مشرقی پاکستان

کل آبادی	۵،۰۸،۴۰،۲۳۵	
غیر مسلم	۹۹،۴۹،۷۵۴	(قریب ایک کروڑ یعنی کل آبادی کا پانچواں حصہ)
مسلمان	۴،۰۸،۹۰،۴۸۱	

مغربی پاکستان

کل آبادی	۳،۹۴،۴۲،۴۳۹
غیر مسلم	۱۲،۱۴،۲۲۵
مسلم	۳،۸۲،۲۸،۲۱۴

لیکن مغربی پاکستان کی یہ آبادی صرف اس کے چار صوبوں پر مشتمل تھی۔ قبائلی علاقے' گلگت' بلتستان' وغیرہ کی آبادی اس میں شامل نہیں تھی۔ اسے الگ دکھایا گیا تھا کیونکہ اس وقت انہیں حقِ رائے دہندگی نہیں دیا گیا تھا۔ انتخابات کے زمانے میں انہیں حقِ رائے دہندگی تو دے دیا گیا لیکن انہیں مغربی پاکستان کی مجموعی آبادی

میں شامل نہ کیا گیا۔ اس آبادی کو بھی شامل کر لیا جائے، نیز اس کے علاوہ آزاد کشمیر اور کشمیری مہاجرین کو بھی[1]، تو مغربی پاکستان کی آبادی کی یہ صورت ہوگی۔

کل آبادی ——— ۴، ۵۳، ۸۰، ۳۷۸

غیر مسلم ——— ۱۲، ۱۴، ۲۲۵

مسلم ——— ۴، ۴۱، ۶۶، ۱۵۳

اس اعتبار سے، پاکستان کے دونوں بازوؤں کی مسلم آبادی کی یہ شکل ہوگی :-

مغربی پاکستان ۴، ۴۱، ۶۶، ۱۵۳

مشرقی پاکستان ۴، ۰۸، ۹۰، ۴۸۱

مغربی پاکستان میں زیادتی ۳۲، ۷۵، ۶۷۲

یہ اعداد و شمار آبادی کے لحاظ سے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک نشستوں کی تعداد ووٹروں کی تعداد کے لحاظ سے مقرر کرنی چاہیئے۔ اگر ایسا کیا جائے تو مغربی پاکستان کے حصے میں کہیں زیادہ نشستیں آئی ہیں، کیونکہ مشرقی پاکستان میں بچوں کی وفات کا تناسب بہت زیادہ ہے

واضح رہے کہ ہم نے اعداد و شمار کی پوزیشن محض اس لئے واضح کی ہے کہ مغربی جمہوریت کی رُو سے انتخابات کا انحصار انہی پر ہوتا ہے۔ ورنہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم تو یہ بھی نہیں چاہتے کہ مردم شماری کی رپورٹ میں، مشرقی اور مغربی پاکستان کی آبادی بھی الگ الگ دکھائی جائے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ آبادی پورے کے پورے پاکستان کی بلا تخصیص و تمیز دکھائی جائے۔ تخصیص صرف مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی آبادی میں ہو۔ اسلام میں بنگالی اور غیر بنگالی، اور غیر بنگالی میں بلوچی، سندھی، پنجابی، افغان کی تخصیص و تمیز قطعاً جائز نہیں۔ وہاں تو ——— عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔

کہا یہ جائے گا کہ جب مسٹر بھٹو کو معلوم تھا کہ جمہوریت کی رُو سے (جسے وہ خود تسلیم کر چکے ہیں) فیصلہ اکثریت کی

---

[1] چار صوبوں کی آبادی ——— ۳، ۹۴، ۴۲، ۴۲۹

قبائلی علاقے ——— ۳۴، ۳۷، ۹۳۹

گلگت وغیرہ ——— ۳، ۰۰، ۰۰۰

آزاد کشمیر ——— ۱۲، ۰۰، ۰۰۰

کشمیری مہاجرین ——— ۱۰، ۰۰، ۰۰۰

۴، ۵۳، ۸۰، ۳۷۸

الیکشن میں ان کیلئے سات نشستیں الگ دی گئی تھیں

پارٹی ہی کا قولِ فیصل قرار پاتا ہے تو انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کی مخالفت کیوں کی۔ جہاں تک حالات کا ہم مطالعہ کر سکے ہیں، ہمارے خیال میں مسٹر بھٹو کا اس مخالفت سے یہ مقصود نہیں تھا کہ وہ کسی طرح عوامی لیگ کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دیں، یا شیخ صاحب کی پوزیشن کو غیر مؤثر بنا دیں۔ اصولِ جمہوریت کی رُو سے ایسا ناممکن تھا۔ نہ ہی ان کا یہ مقصد ہو سکتا تھا کہ اس طرح سرے سے انتخابی نتائج ہی کو کالعدم قرار دے کر موجودہ عسکری نظام کو علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے۔ مسٹر بھٹو ایسے پاگل نہیں۔ انہیں مغربی پاکستان کے دو اہم ترین صوبوں میں مستحکم اور بلامنت غیرے حکومت قائم کرنے کی حیثیت حاصل ہے اور مرکز میں بھی ان کی پوزیشن (اور کچھ نہیں تو کم از کم) ایک مؤثر اپوزیشن کی ہوگی۔ ان حالات میں وہ کیسے چاہیں گے کہ انتخابات کے نتائج کالعدم قرار دلوا کر اپنی اتنی بڑی پوزیشن کو ضائع کر دیں۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں چھ نکات کی مخالفت سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اہلِ پاکستان پر واضح کر دیں کہ ان سے مرکز کی حیثیت کس قدر کمزور ہو جاتی ہے اور یہ چیز پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لئے کس قدر خطرناک ہے۔ اپنے اسی مقصد کو انہوں نے ۱۴ مارچ کو کراچی کے جلسہ عام میں اپنی تقریر کے آغاز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> اس میں کوئی شک نہیں کہ آج پاکستان میں سب سے خطرناک اور اہم بحران ہے۔ ہم دیکھ رہے کہ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے، ہمارے ملک میں بحران ہی بحران رہا ہے۔ ہمارے غریب عوام یہ سمجھیں گے کہ اس ملک میں شاید یہ رسم ہی بن گئی ہے کہ پاکستان کے لیڈر ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ بحران ہے بحران ہے، کبھی اسلام خطرے میں ہے، کبھی ملک کی سالمیت خطرے میں ہے۔ اس وقت بھی یہی بات کہی جا رہی ہے کہ پاکستان خطرے میں ہے، ملک کی سالمیت خطرے میں ہے۔ بھائیو! یہ درست ہے کہ سب سے خطرناک بحران موجودہ بحران ہے۔ اس بحران کے نتیجہ میں ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ سب سے بڑی اسلامی مملکت جس کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے قربانیاں دیں تیس لاکھ مسلمانوں نے پاکستان کو وجود میں لانے کے لئے جان کی قربانی دی، اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے کہ کیا پاکستان ایک رہیگا یا ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ یہ ایک سخت اور پیچیدہ بحران ہے۔
>
> (روزنامہ مساوات۔ ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء)

ہم سمجھتے ہیں کہ اپنی مسلسل تگ و تاز سے مسٹر بھٹو اپنے اس مقصد میں ضرور کامیاب ہو گئے ہیں کہ انہوں نے چھ نکات کے مضمرات کو قوم کے سامنے واشگاف انداز میں رکھ دیا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے عوام ان سے بہت کم واقف تھے۔ آنے والا مؤرخ جب موجودہ بحران کی تاریخ مرتب کرے گا تو وہ مسٹر بھٹو کے اس احسان کو نمایاں مقام دے گا جو اس شعور کی بیداری سے انہوں نے قوم پر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان لیڈروں کو، جو مسٹر بھٹو کے خلاف جذبۂ انتقام،

یا شیخ مجیب الرحمٰن سے چند وزارتیں حاصل کرنے کے خواب کی بنا پر اس مسئلہ پر بھٹو کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یقیناً ملت فروشوں کی صف میں کھڑا کرے گا اور کہے گا کہ ــــ قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند!

بعض لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ جب شیخ مجیب الرحمٰن مرکز میں بھی صاحبِ اقتدار ہوں گے تو انہیں مرکز کے مضبوط اور طاقتور ہونے پر کیوں اعتراض ہے۔ انہیں تو بلکہ اس پر اور بھی خوش ہونا چاہیئے۔ وہ یہ بھی پوچھتے ہیں کہ مسٹر بھٹو اس پر کیوں مصر ہیں کہ آئین میں ایسی شقیں رکھی جائیں جن سے مرکز مضبوط رہے۔ جب مرکز کا کنٹرول مجیب صاحب کے ہاتھ میں رہنا ہے تو بھٹو صاحب کو کمزور مرکز کی تائید کرنی چاہیئے۔ اس قسم کے سوالات وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اس کا علم نہیں کہ مضبوط مرکز سے مراد کیا ہوتی ہے اور آئین میں ایسی شقیں رکھنے سے عملی مفہوم کیا؟ مضبوط مرکز سے مراد یہ ہوتی ہے کہ پورا ملک زیادہ سے زیادہ طاقتور رہے، اور کمزور مرکز کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کے مختلف حصے طاقتور رہتے ہیں لیکن مملکت بہ حیثیت مجموعی کمزور ہو جاتی ہے۔ باقی رہا ان شقوں کا آئین کے اندر داخل کرنا، سو ایک آئینی حکومت میں 'صاحبِ اقتدار' اتھارٹی کے کسی فیصلے یا قانون کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا' خواہ پارلیمانی نظام میں یہ اتھارٹی وزیر اعظم کی ہو اور خواہ صدارتی نظام میں صدر مملکت کی۔ لیکن ان کا کوئی فیصلہ یا اقدام جو آئین سے ٹکرائے، اسے عدالتِ عالیہ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر بھٹو نے جو یہ شرائط پیش کی ہیں کہ آئین میں ایسی شقیں رکھی جائیں جن سے مملکت کی حیثیت کمزور نہ ہونے پائے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کل کو پارلیمان یا انتظامیہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جس سے مملکت کمزور ہوتی ہو' تو ان کے اس اقدام کو عدالت میں چیلنج کیا جا سکے۔

بعض حلقوں میں لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آئین سے متعلق بحث و تمحیص کا مقام مجلس آئین ساز کے اندر ہوتا ہے۔ مسٹر بھٹو نے، اسمبلی کے آغاز سے پہلے ہی بحث و گفتگو اور افہام و تفہیم کی کوشش کیوں شروع کر دی۔ یہ اس لئے کہ صدر مملکت کے (L. F. O.) میں یہ شرط رکھ دی گئی ہے کہ اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے کے بعد ایک سو بیس دن میں آئین مرتب ہو جانا چاہیئے۔ ایسا نہ ہوا تو انتخابات کالعدم قرار دے دیئے جائیں گے۔ مسٹر بھٹو نے چاہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ مسائل اسمبلی شروع ہونے سے پہلے ہی طے کر لئے جائیں تاکہ اسمبلی شروع ہونے کے بعد ایک سو بیس دن کے اندر آئین مکمل ہو جائے۔ ان کی یہ کوشش سب کے لئے منفعت بخش تھی، لیکن بُرا ہو تعصب اور ذاتی انتقام جوئی کا کہ ان کے مخالفین کی طرف سے اس کی بھی مخالفت کی گئی۔ مسٹر بھٹو نے صدر مملکت سے کہا تھا کہ یا تو اسمبلی کے انعقاد کی تاریخ ذرا آگے بڑھا دی جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ایک سو بیس دن کی شرط اٹھا دی جائے۔ آپ غور فرمائیے کہ یہ مطالبات کس قدر معقول اور مفادِ ملکی پر مبنی تھے! صدر مملکت نے ان کی افادیت اور معقولیت کے پیشِ نظر، اسمبلی کے آغاز کی تاریخ بڑھا دی، لیکن بجائے اس کے کہ ان کا شکریہ ادا کیا جاتا، ملک میں ہنگامے برپا ہونے شروع ہو گئے۔ تعصب کا رنگین چشمہ چڑھا لیا جائے تو انسان اپنے نفع و نقصان کو بھی پہچاننے کے

قابل نہیں رہتا۔

(۰)

اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔

جہاں تک شیخ مجیب الرحمن کا تعلق ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ (بربنائے مصلحت ہو یا دلی آرزو کے مطابق، کم از کم سردست) مغربی پاکستان سے یکسر انقطاع کے حق میں نہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اب سے کچھ وقت پہلے، پریس کے ایک نمائندہ نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا آپ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو جانا چاہتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا (NOT YET)۔ ابھی نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک ابھی اس (YET) کا وقت نہیں آیا۔ اور بحالاتِ موجودہ، یہ بھی غنیمت ہے۔ ہمارے نزدیک، ان سے یہ غلطی ہو گئی کہ انہوں نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر بنگالیوں کے جذبات کو جو ابھار لے، تو اس سے وہاں کے انتہا پسندوں کے ہاتھ اتنے مضبوط ہو گئے ہیں کہ اب خود مجیب صاحب بھی ان سے خائف ہیں۔ اس عنصر سے خوف زدہ ہونے کی وجہ سے ان کی بے بسی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ وہاں کے انتہا پسندوں نے پاکستان کا جھنڈا جلا دیا اور جب مجیب صاحب سے پوچھا گیا کہ اس المیہ کے متعلق ان کی کیا رائے ہے تو انہوں نے اس پر تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ان کی بے بسی نہیں تو اور کیا تھا؟ انہیں ڈر ہے کہ "الہ دین" کے جس تمثیلی جنّ کو وہ بوتل سے نکال چکے ہیں، اگر انہوں نے اسے پھر سے بوتل میں بند کرنا چاہا تو وہ (جنّ) کہیں خود انہیں ہی نہ جھپٹ لے!

وہ اس کشمکش میں بُری طرح ماخوذ ہیں۔ وہ تو یوں کہیے کہ ایسے نازک وقت میں اس گرگِ باراں دیدہ (مولانا بھاشانی) کی دورنگی کام دے گئی۔ ان کے اس اعلان سے کہ وہ مجیب صاحب کے ہمنوا ہیں، انتہا پسند عناصر کے پاؤں رُک سے گئے۔ اگر وہ مدد کو نہ پہنچتے تو مشرقی پاکستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا اور معلوم خود مجیب صاحب کی بھی کیفیت کیا ہوتی۔ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ وہاں کی عدمِ تعاون کی تحریک، عدمِ تشدد کی پابند ہے تو اس کا سہرا بھی بھاشانی صاحب کی حکمتِ عملی کے سر ہے

اس سلسلہ میں ایک اور اہم حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ پاکستان ہی نہیں، اس وقت مسلمانوں کے کسی ملک میں بھی، ان کی اندرونی سیاست، اہلِ ملک کے اپنے ہاتھ میں نہیں۔ اس وقت ساری دنیا کی سیاست کے تار، امریکہ، روس، چین، جیسی عظیم قوتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اور افریقی — ایشیائی ممالک بالعموم، اور مسلمانوں کے ممالک ..... بالخصوص ان کی باہمی رسہ کشی کی رزمگاہ ہیں۔ ویت نام میں امریکہ کا جو حشر ہو رہا ہے اسکے

حال کے پیشِ نظر اسے ذرا ادھر ہٹ کر اپنا اڈہ جمانے کے لئے ایک خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ اور اس کی نگاہوں میں بنگال کا خطہ اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس کی (GREATER BENGAL) کی اسکیم اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔ لیکن پاکستان نے جو اپنے روابط چین سے قائم کر لئے تو یہ چیز اس کے ان مشئوم ارادوں کی کامیابی کی راہ میں حائل ہو گئی۔ اس سنگِ گراں کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے اس نے یہ سوچا کہ مشرقی پاکستان کو ایک آزاد مملکت بنا دیا جائے اور اس آزاد مملکت کو چین کے ساتھ روابط قائم نہ کرنے دیئے جائیں۔ وہ شاید اس وقت تک ایسا کر چکتا لیکن (اس کی بدقسمتی سے) مغربی بنگال میں (NAXALITES) کا زور ہو گیا جس کی وجہ سے "عظیم بنگال" کی اسکیم سر دست ناقابلِ عمل ہو گئی۔ بنا بریں' اندازہ یہ ہے کہ اس وقت مشرقی پاکستان کی قطعی علیحدگی خود امریکہ کے نزدیک بھی قرینِ مصلحت نہیں۔

ادھر مغربی پاکستان میں بلوچستان اور صوبہ سرحد میں ایسے عناصر کو کامیابی حاصل ہو گئی ہے جن کا رجحان روس کی طرف ہے اور روس کی نگاہیں بھی ان علاقوں پر ہیں۔ اس کا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ مرکز کمزور سے کمزور تر ہو جائے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ مغربی پاکستان میں روس پسند عناصر بھی کس طرح مسٹر بھٹو کے خلاف محاذ قائم کر رہے ہیں۔ ادھر کابل میں عبدالغفار خان صاحب تشریف فرما ہیں جن کے صاحبزادہ (ولی خان) انہیں آئے دن ملنے چلے جاتے ہیں اور ابھی ابھی "لندن" سے اپنے زاویۂ نگاہ کو سٹ کرا کر آئے ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بھی امریکہ اسی میں مصلحت دیکھے گا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان سر دست علیحدہ نہ ہوں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) "ابلیس کے تعویذ" ہی سے سہی، اگر اس وقت علیحدگی کی بلا کسی طرح بھی ٹل جائے تو یہ ہمارے لئے ازبس غنیمت ہوگا۔ اس سے ہمیں سانس لینے کا وقفہ مل جائے گا اور ہم سوچ سکیں گے کہ مشرق اور مغرب میں جو خلیج اس درجہ وسیع ہو گئی ہے اسے کس طرح پاٹا جائے۔ نصیب اچھے ہوں تو بعض اوقات مرض کی شدت خود علاج بن جایا کرتی ہے' اور طوفان بھی کشتیوں کو تالبِ ساحل لے آنے کا موجب ہو جاتے ہیں۔ اگر اس وقت مفاہمت کی کوئی شکل نکل آئی اور فضا میں سکون پیدا ہو گیا تو ہم ملک کے اس طبقہ سے جو پاکستان کی بقا اور استحکام کا درد اپنے دل میں رکھتا ہے اور اس کی سالمیت اور سلامتی کا آرزومند ہے' بزور درخواست کریں گے کہ وہ گزشتہ تئیس سال کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے وہ شکوک و شبہات دور ہو سکیں جو ایک دوسرے کی طرف سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم مغربی پاکستان کے ہر دردمند محبِ پاکستان سے بزور درخواست کریں گے کہ وہ ان شکوک و شبہات کے رفع کرنے کے سلسلہ میں' جو ہمارے بنگالی بھائیوں کے دل میں ہماری طرف سے پیدا کر دیئے گئے ہیں' جو کچھ بھی بن پڑے کرے۔ وہ ایک ایک بنگالی کو سینے سے لگائے اور اسے بتائے کہ جو عناصر انہیں بھارت کی طرف رُخ کرنے کی "سکھشا" دے رہے ہیں' وہ کس طرح ان کا نام و نشان تک

مٹا دینے کی سازش میں مصروف ہیں۔

(۰)

یہ سطور ۱۵ مارچ کو سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد حالات کیا کروٹ لیں۔ اب معاملہ شیخ مجیب الرحمٰن اور صدرِ مملکت کے درمیان ہے۔ مجیب صاحب نے جو یہ مطالبات بڑھا دیئے ہیں کہ اقتدار اکثریت کی طرف منتقل کر دیا جائے اور مارشل لاء اٹھا دیا جائے تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ اتنی بڑی ذمہ داریوں کے حامل لیڈر نے ایسے مطالبات پیش کر دیئے جو ممکن العمل ہی نہیں۔ مملکت کا وجود یا تو کسی نہ کسی آئین کی بنیادوں پر قائم رہتا ہے اور یا مارشل لاء پر، اگر ملک میں کوئی آئین نافذ العمل نہ ہو اور مارشل لاء اٹھا دیا جائے تو اس مملکت کی عمارت کس بنیاد پر قائم رہے گی اور جنہیں اقتدار تفویض کیا جائے گا وہ کون سے آئین کے ماتحت اس کا استعمال کریں گے؟ آئین کے بغیر اقتدار انارکی بن کے رہ جاتا ہے۔

پھر اپنے اس ناممکن العمل اور انتہائی غیر منطقی مطالبہ کے منوانے کے لئے جو طریق کار انہوں نے اختیار کیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ ہمیں قرآنِ کریم نے تعلیم یہ دی تھی کہ اپنی بات دلیل و برہان کی رُو سے پیش کرو۔ اور فریقِ مخالف سے بھی کہو کہ فاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین۔ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔ جب معاملہ دلیل و برہان کی رُو سے سلجھایا جائے تو اس کا اطمینان بخش حل مل سکتا ہے۔ لیکن جب اپنی بات دھاندلی اور دھونس سے منوانے کی کوشش کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ فریقِ مقابل اس کے سامنے جھک جائے لیکن اس سے معاملہ سلجھ نہیں سکتا۔ مجیب صاحب نے دلیل و برہان کے بجائے شورشوں، ہنگاموں اور سول نافرمانی کا جو طریق کار اختیار کیا ہے اس سے وہ اپنے پندار کی تسکین تو کر سکتے ہیں لیکن پاکستان کی بھلائی نہیں۔ کیا یہ چیز تعجب انگیز نہیں کہ جمہوریت کے علمبردار اپنی بات غیر جمہوری طریق سے منواتے ہیں؟ مجیب صاحب حکومت سے بار بار کہتے ہیں کہ "قوت کا استعمال چھوڑ دو"۔ اور خود اپنی بات قوت ہی کے بل پر منوانا چاہتے ہیں۔ ملک میں انتشار پیدا کر کے، نظم و نسق کی مشینری کو مختل کر دینا، توپ اور بندوق کی قوت سے بھی زیادہ تخریب انگیز قوت ہوتی ہے۔ گاندھی کی اس ایجاد نے ساری دنیا کی فضا کو مسموم کر دیا۔ اب لوگوں نے دلیل و برہان سے کام لینا ہی چھوڑ دیا، حالانکہ یہی وجہِ شرفِ انسانیت تھا۔

بہرحال یہ ہیں وہ نہایت پیچیدہ اور مشکل حالات جن کا سامنا صدرِ مملکت کو کرنا ہے۔ اب ساری قوم کی آنکھیں انہی کی طرف لگ رہی ہیں۔ انہوں نے قوم سے وعدہ کیا ہے کہ جب تک زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے وہ پاکستان کی سالمیت اور استحکام پر ذرا سی بھی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ اگر وہ اپنے اس عظیم مقصد میں کامیاب ہو گئے تو تاریخ میں انہیں حیاتِ دوام حاصل ہو جائے گی۔ ہماری دعا ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب و کامران ہوں۔ اسی میں ہماری اور آپ کی، مغربی اور مشرقی پاکستان کی بلکہ خود مملکت پاکستان کی سلامتی ہے۔

ہم مسٹر بھٹو سے بھی عرض کریں گے کہ انہوں نے جو مقصد اپنے سامنے رکھا تھا اس میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ عوام کے سامنے یہ حقیقت آ گئی ہے کہ چھ نکات کے مضمرات کیا ہیں اور مشرقی پاکستان کے تخریب پسند عناصر کے عزائم کیا۔ بحالاتِ موجودہ وہ اس سے زیادہ کچھ اور کر نہیں سکتے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ وہ کوئی اور مطالبہ پیش نہ کریں اور مجلسِ آئین ساز میں (اگر وہ متشکل ہوتی ہے تو) اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے جائیں تاکہ یہ چیز مملکت کے مستقل ریکارڈ میں آ جائے۔ اسی ضمن میں وہ یہ بھی واضح کر سکتے ہیں کہ مغربی پاکستان کے جو شکست خوردہ "لیڈر" اقتدار کی بھیک مانگنے کے لئے بھاگے بھاگے ڈھاکہ آ جا رہے ہیں اور انہیں اس کا قطعاً خیال نہیں کہ اس سے مملکتِ پاکستان کا کیا حشر ہوگا، ان کا ماضی کیا ہے؟ البتہ ہم مسٹر بھٹو کو ایک مشورہ ضرور دیں گے اور وہ یہ کہ وہ اپنی آخری کوشش کر دیکھیں جس سے مجوزہ آئین میں (اگر اس کے بننے کا امکان ہو تو) یہ شق ضرور شامل کر لی جائے کہ مملکت کے کسی صوبے کو مرکز سے علیحدگی (SECESSION) کا حق حاصل نہیں ہوگا اور اس قسم کی کوئی کوشش مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف سمجھی جائے گی۔ اگر سردست اتنا بھی ہو جائے تو اسے غنیمت سمجھا جائے گا اور اس کے لئے آنے والی نسلیں اُن کی شکر گزار ہوں گی۔

باقی رہا پاکستان کے مستقبل کا سوال، سو اگر صدر یحییٰ کی کوششوں سے (سردست ہی سہی) مملکت کی سالمیت برقرار رہی اور (جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے) اس طرح ہمیں سانس لینے کا وقفہ میسر آ گیا تو شیخ مجیب الرحمٰن (اور انکی وساطت سے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں) سے یہ بنیادی سوال پوچھنا ہوگا کہ وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو 'دین (اسلام) کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم سمجھتے ہیں یا ہنگلہ دیش کے باسیوں کو (وطنیت کی بنیاد پر) ایک الگ قوم قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ ایمان کے اشتراک کو قومیت کی بنیاد قرار دیتے ہیں تو پھر ایسی تدابیر سوچی جا سکتی ہیں جن سے مملکت کی وحدت اور سالمیت برقرار اور مستحکم رہے۔ لیکن اگر ان کے نزدیک قومیت کی بنیاد وطن کا اشتراک ہے (اور بنگلہ دیش کو وہ الگ وطن سمجھتے ہیں) تو پھر وحدتِ پاکستان کی کوئی صورت باقی نہیں رہ سکتی۔ پاکستان کی تو بنیاد ہی قومیت کے اسلامی تصور پر ہے۔ اگر کوئی اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا تو پھر وہ مملکت کی وحدت کو کس طرح تسلیم کرے گا۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بنائے نزاع ہی قومیت کا نظریہ تھا۔ اگر وہاں اشتراکِ وطن کو قومیت کی بنیاد تسلیم کر لیا جاتا تو پاکستان وجود ہی میں نہ آتا۔ لہٰذا، پاکستان کے مستقبل کا مسئلہ، مشرقی اور مغربی پاکستان میں سیاسی یا معاشی مفاہمتوں کا نہیں، اصل مسئلہ قومیت کی بنیاد کا ہے۔ اگر فضا پُرسکون ہو جائے تو اس کی وضاحت سب سے مقدم ہوگی، کیونکہ پاکستان کے مستقبل کا انحصار اسی سوال کے جواب پر ہے۔

(※)

دُرِ منثور

ان موتیوں میں سے چند ایک جو اقبالؒ کے مکتوبات و دیگر تحریرات نثر میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔

———— (۰) ————

داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

(دیباچہ پیام مشرق)

نسل پرستی

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدتِ انسانیت کے لئے دقیانوسی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدتِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہو گا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قویٰ کو بیکار کر دے۔ انسانوں کے سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

قومیت

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشری نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے جسے اسنے تشکیل کیا ہے۔ یہاں

تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئتِ اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصولِ وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

مذہب اور سیاست

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام امتیازات کے، عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں)

شریعت کا مقصود

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود متعین کرتا ہے۔ ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط، ۱۹۳۶ء)

دورِ انحطاط کے پیشوا

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء، فلاسفہ، سیاسیین وغیرہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے ابھارتا ہے چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے اور انہیں خوش آئند و درخشاں بتلاتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رہبانیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں، اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو شل اور ان کی روحانی قوتِ نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔

(بیان متعلقہ احمدیت)

مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علامات زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اسکی فلسفیانہ بحثیں۔ اس کے تصورات اور اس کے واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں، اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بین ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیات روحانی کی تشکیل نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشوونما اور اسکے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق۔ اخبار لائیٹ کے جواب میں)

اسلام پر نازک وقت

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

قرآن کی کاملیت

ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے۔ اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قوانین اس میں موجود ہیں۔

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

دور حاضر کا مجدد

میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس وقت جو شخص قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دیگا وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔ اور نبی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

محاورۂ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں

ہرگز نہیں۔ (سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

ملّت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کیلئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے ڈرتا ہے صوفیا اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خان کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

نازک وقت

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتداء یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تاریخ کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کے مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے ہیں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

اضطراب

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بیچینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرلے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

احترامِ آدمیت

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے (ریڈیو تقریر۔ ۱۹۳۸ء)

وحدتِ انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوعِ انسان کی وحدت ہے، جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

قومیت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا منتہا افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تخلیق و تجدید ہو، قابلِ احترام ہے۔

(دیباچہ پیامِ مشرق)

وطنیت

میں یورپی تصورِ وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کمتر مادی فوائد حاصل ہونگے، بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

مسلم لیگ کیلئے فیصلہ

مسلم لیگ کو آخرکار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی تک محدود رہیگی یا مسلمان عوام کی نمائندگی بھی کریگی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔

(قائداعظمؒ کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

نازک ترین دور

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدر حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۷ء)

معرکۂ دین و وطن

علامہ اقبالؒ

حصولِ پاکستان کے دعوے کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ اسلام میں قومیت کا مدار، وطن، نسل، حسب و نسب زبان وغیرہ کی نسبتوں پر نہیں بلکہ آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک پر ہے۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں اس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اشتراکِ وطن کی بنا پر، ہندوستان (یعنی ہندو) قوم کا جزو نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی جہت سے، ایک جداگانہ مستقل قوم ہیں، اور جب یہ ایک مستقل قوم ہیں تو انہیں اپنی الگ مملکت متشکل کرنے کا حق حاصل ہے، جہاں یہ اسلام کے تابع آزاد زندگی بسر کر سکیں۔ یہ دعوے قرآن کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اور اسلام کی روح تھا۔ لیکن (بدقسمتی سے) ہندوستان کے مسلمانوں ہی کے ایک گروہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ اور مزید بدقسمتی یہ کہ اس گروہ کے سرغنہ "نیشنلسٹ علمائے کرام" تھے، چنانچہ یہ موضوع کہ اسلام میں قومیت کا مدار کیا ہے، اُس زمانہ میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اور طلوعِ اسلام لفظ بلفظ نگاہ کا سرگرم نقیب تھا۔ اس باب میں، علامہ اقبالؒ کا ایک بیان (جس کا عنوان معرکۂ دین و وطن تھا) قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس معرکہ آرا بیان کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں عین اس وقت جب کہ برصغیر ہند کے مسلمان اپنی جداگانہ قومی حیثیت کا پرچم لے کر اٹھے تھے اور مسلم لیگ ان کی اس قومی حیثیت کی آئینی و قانونی توثیق کے لئے کانگرس سے برسرِ پیکار تھی۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کے پیشوا اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے دلّی کی ایک تقریر میں یہ اعلان کیا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"۔ ایک مشہور و معروف مذہبی پیشوا کی زبان سے یہ نعرہ؟ ۔۔۔ شاید مسلمان اس فتنۂ عظیم کو جو اس نعرہ میں پوشیدہ تھا ایک عرصہ تک سمجھنے کے قابل نہ ہوتے اور "شیخ الہند" کی یہ آواز کانگریس کے مہاسبھائی عزائم کے حق میں اپنا کام کر جاتی۔ لیکن علامہ مرحوم جو ان دنوں بسترِ مرض (بلکہ مرضِ الموت) پر پڑے تھے اس

نعرے کی فتنہ انگیزیوں کو نظر انداز نہ کر سکے ۔ اپنی شدید علالت کے باوجود ملت کا یہ قلبِ حساس تڑپ اٹھا۔ اور اس کی یہ تڑپ وخلش اس آہِ آتشین کی صورت میں لبوں تک آگئی ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے نیشنلسٹ حلقہ بگوش اس سے بڑے طیش میں آئے اور بالخصوص مولانا موصوف نے اس کے جواب میں ایک بیان شائع کر کے جہاں علامہ اقبالؒ کو عربی زبان سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا "وہاں" قاموس" کے حوالوں سے" قوم" اور" ملت" کا فرق واضح کرنے کی بھی کوشش کی اور یہ کہا کہ انہوں نے (جیسا کہ علامہ اقبال کے مذکورہ شعر میں کہا گیا ہے) اپنی تقریر میں "ملت" نہیں بلکہ" قوم" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ علامہ اقبال کے نزدیک مولانا مدنی کی یہ کوشش" عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مترادف تھی ۔ چنانچہ وہ ان پیدا کردہ فتنوں سے ملت اسلامیہ کے مستقبل کو بچانے کے لئے غیرتِ دینی سے مسلح ہو کر میدان میں آگئے اور بیماری کے عالم میں زیرِ نظر تاریخی بیان حوالۂ اشاعت کیا۔ "معرکۂ دین و وطن" کی اس آویزش میں جو اُس وقت ملک میں جاری تھی۔ اس بیان نے ضربِ کلیم کا کام دیا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کے تمام قلعے مسمار ہو کر رہ گئے ۔ ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے مسلمان کی منزل پوری طرح نکھر کران کی نگاہوں کے سامنے آگئی ۔ اور دین کا عطا فرمودہ قومی تصوّر (وطنی قومیت کے نظریے کو شکستِ فاش دے کر اساسِ دین پر ایک جداگانہ مملکت (پاکستان) کو معرضِ وجود میں لانے میں کامیاب وکامران ہو گیا۔

پاکستان وجود میں آگیا تو ہر چشمِ بینا اس انقلاب کو دیکھ کر دقفِ حیرت ہو گئی کہ وہ نظریہ قومیت جو اس مملکت کی اساس وبنیاد تھا، اس طرح نظر انداز کر دیا گیا کہ نسیاً منسیاً ہو گیا۔ گویا وہ کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہ تھا۔ یہاں تک کہ غیر مسلموں کو مسلم قوم کا جزو تسلیم کر لیا گیا بلکہ مسلم قومیت کی بنیاد بھی وطن پا گیا ۔ اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے آج ایک طرف بڑے فخر سے "بنگلہ دیش" کو ایک جداگانہ قومیت کی اساس قرار دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف مغربی پاکستان میں ان صوبوں کی بنیادوں پر الگ الگ قومیتوں کے احساس کو ابھارا جا رہا ہے جو انگریزی عملداری میں انتظامی سہولت کی خاطر وجود میں لائے گئے تھے۔ علامہ اقبال نے اس زمانے میں کہا تھا کہ ـــ بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن ـــ اور ہم سمجھتے ہیں کہ آج اس معرکہ کی شدت اس سے کہیں بڑھ چکی ہے۔ اس تباہی سے بچنے کی اس کے سوا اور کوئی شکل نہیں کہ اسلامی قومیت کی اساس و بنیاد کو بار بار نمایاں طور پر سامنے لایا جائے۔ اس مسئلہ کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر علامہ اقبال کا یہ بیان بار دگر پیشِ خدمتِ قارئین ہے ضرورت ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کا نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا جائے ۔

بیان

میں نے اپنے مصرع

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است

میں لفظ "ملّت" "قوم" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی اور بالخصوص قرآن مجید میں یہ لفظ "شرع" اور "دین" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن حال کی عربی، فارسی اور ترکی زبان میں بکثرت سندات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "ملّت" "قوم" کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں بالعموم "ملّت" بمعنی "قوم" ہی استعمال کیا ہے۔ لیکن چونکہ لفظ "ملت" کے معنی زیرِ بحث مسائل پر چنداں مؤثر نہیں ہیں اس واسطے اس بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد صاحب کا ارشاد یہی تھا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔"

یورپ کی ملوکانہ اغراض اور نظریہ وطنیت

مجھ کو حقیقت میں مولانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں۔ اعتراض کی گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ زمانہ حال میں اقوام کی تشکیل اوطان سے ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے، کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کریں۔ ایسے مشورہ سے "قومیت" کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کا ایک اہم دینی پہلو ہے جس کی تنقید ایک مسلمان کے لئے ازبس ضروری ہے مجھے افسوس ہے کہ میرے اعتراض سے مولانا کو یہ شبہ ہوا کہ مجھے کسی سیاسی جماعت کا پروپاگنڈا مقصود ہے۔ حاشا وکلا میں نظریہ وطنیت کی تردید اس زمانہ سے کر رہا ہوں جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "فرنگی نظریۂ وطنیت" کی اشاعت کی جائے چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی۔ اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانے کا الٹ پھیر بھی عجیب ہے ایک وقت تھا کہ نیم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفریج میں گرفتار تھے، اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید یورپ کے جدید نظریئے ان کے لئے جاذبِ نظر ہیں۔ مگر افسوس ؎

نو نگردد کعبہ را رختِ حیات گر ز افرنگ آیدش لات و منات

سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" قابل اعتراض نہیں، اس لئے کہ قدیم الایام سے "اقوام" "اوطان" کی طرف اور "اوطان" "اقوام" کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذا القیاس چینی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔ "وطن" کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ اور۔ کل تک اہل برما — ہندوستانی — تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں "حب الوطن من الایمان" کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے، اس لئے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

اسلام اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ

مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلام ہو۔ نامعقول و مردود ہے اس تخیل سے بعض سیاسی مباحث پیدا ہوتے ہیں جن کا ہندوستان سے خاص تعلق ہے، مثلاً یہ کہ کیا مسلمان اور قوموں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے؟ یا — ہندوستان کی مختلف قومیں یا ملتیں ملکی اغراض کے لئے متحد نہیں ہو سکتیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ میرا مقصد اس وقت صرف مولانا حسین احمد صاحب کے قول کے دینی پہلو کی تنقید ہے اس لئے میں ان مباحث کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔

اسلام واحد جماعتی نظام ہے

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے، اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے۔ تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے

اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا ہی داعی نہیں۔ بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" "قومی" تھا جیسے مصریوں یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں "نسلی" قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ "دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے"۔ جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ "دین" چونکہ پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس لئے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف "اسٹیٹ" ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہً "انسانی" ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل "قوم" اور "نسل" پر بنا نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کہا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک "امت" کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے ؎

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

مسلمانوں کو بروقت انتباہ

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرف انسانی کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہوگئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہیں بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس "وطن" کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا۔ اور ہو رہا ہے۔ ان کے اس انتخاب کا؟ لوتھر کی "اصلاح"۔ غیر مسلم "عقلیت" کا دور۔ اصول "دین" کا "سٹیٹ" کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں مل کر یورپ کو کس طرف لے گئیں؟ لادینی۔ جہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف۔ کیا مولانا حسین احمد یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا میں بھی اس تجربہ کا اعادہ ہو؟ مولوی صاحب زمانہ حال میں "قوم" کے لئے "وطن" کی اساس ضروری سمجھتے ہیں۔ بیشک زمانہ حال نے اس اساس کو ضروری سمجھا ہے۔ مگر صاف ظاہر ہے کہ یہ کافی نہیں۔ بلکہ بہت سی اور قوتیں بھی ہیں۔ جو اس قسم کی "قوم" کی تشکیل کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً "دین" کی طرف سے بے پروائی۔ روزمرہ سیاسی زندگی میں انہماک۔ اور علیٰ ہذا القیاس۔ دیگر مؤثرات جن کو مدبرین اپنے ذہن سے پیدا کریں تاکہ ان ذرائع سے اس قوم میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ مولوی صاحب اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کہ اگر ایسی "قوم" میں مختلف ادیان و ملل ہوں تو بھی رفتہ رفتہ وہ تمام "ملتیں" مٹ جاتی ہیں اور صرف لادینی اس قوم کے افراد میں وجہ اشتراک

رہ جاتی ہے۔ کوئی دینی پیشوا تو کیا ایک عام آدمی بھی جو "دین" کو انسانی زندگی کے لئے ضروری جانتا ہے نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں ایسی صورتِ حالات پیدا ہو۔ باقی رہے مسلمان! سو افسوس ہے ان سادہ لوحوں کو اس نظریۂ وطنیت کے لوازم اور عواقب کی پوری حقیقت معلوم نہیں۔ اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ "دین" اور "وطن" بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگی، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

مگر جو فقرہ مولانا حسین احمد کے ارشادیں پوشیدہ ہے وہ زیادہ دقتِ نظر کا محتاج ہے۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ قارئین مندرجہ ذیل سطور کو غور سے پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے:۔

مولانا حسین احمد عالمِ دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے امتِ محمدیہ کے لئے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے لفظ "قوم" استعمال کیا یا لفظ "ملت" ہر اس لفظ سے اس جماعت کو تعبیر کرنا جو ان کے تصور میں امتِ محمدیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور افسوسناک امر ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا ہے۔ لیکن یہ احساس ان کو غلطی کے اعتراف یا اس کی تلافی کی طرف نہیں لے گیا۔ انہوں نے لفظی اور لغوی تاویل سے کام لے کر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ "ملت" اور "قوم" کے لغوی فرق و امتیاز سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ "ملت" کو "قوم" سے ممتاز قرار دینا ان لوگوں کی تشفی کا باعث تو ہو سکے گا۔ جو دینِ اسلام کے حقائق سے ناواقف ہیں، واقف کار لوگوں کو یہ قول دھوکا نہیں دے سکتا۔

دینی وحدت میں مذہب سیاست کی ثنویت

آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریئے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت "قوم" اور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت "ملت" اور۔

دوسرا یہ کہ از روئے "قوم" چونکہ وہ ہندوستانی ہیں اس لئے "مذہب" کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوامِ ہند کی "قومیت" یا "ہندوستانیت" میں جذب ہو جانا چاہیئے۔ یہ صرف "قوم" اور "ملت" کے الفاظ کا فرق ہے۔ ورنہ نظریہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اور جسے اختیار کرنے کے لئے اس ملک کی اکثریت اور اس کے رہنما آئے دن یہاں کے مسلمانوں کو تلقین کرتے رہتے ہیں، یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ چیز سمجھو، اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو، سیاسی اعتبار سے

مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم نہ تصور کرو اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ۔

قرآن سے استشہاد کیوں نہیں؟

مولانا نے بظاہر یہ کہہ کر کہ میں نے لفظ "ملت" اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیا اور میں "ملت" کو "وطنی قوم" سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، گویا اگر "قوم" زمین ہے تو "ملت" بمنزلہ آسمان ہے، لیکن معناً اور عملاً آپ نے ملت کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں چھوڑی۔ اور آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ وعظ فرما دیا ہے کہ ملک و سیاست کے اعتبار سے اکثریت میں جذب ہو جاؤ۔ قوم اور قومیت کو آسمان بناؤ، دین فطرت "زمین" بنتا ہے تو بننے دو۔

مولانا یہ فرض کر کے کہ مجھے "قوم" اور "ملت" کے معانی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی، وہاں "قاموس" کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا۔ مجھے زبانِ عربی سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ سر اور آنکھوں پر۔ لیکن کیا اچھا ہوتا اگر مولانا میری خاطر نہیں تو عامۃ المسلمین کی خاطر "قاموس" سے گزر کر قرآن حکیم کی طرف رجوع کر لیتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ مقدس وحی سے بھی استشہاد فرما لیتے۔

مجھے تسلیم ہے کہ میں عالم دین نہیں نہ عربی زبان کا ادیب ؎

قلندر جز دو حرف لَآ اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

لیکن آپ کو کونسی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف "قاموس" پر اکتفا کی کیا قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ "قوم" استعمال نہیں ہوا؟ کیا قرآن میں "ملت" کا لفظ بار بار نہیں آیا؟ آیات قرآنی میں قوم و ملت سے کیا مراد ہے؟ اور کیا جماعتِ محمدیہ کے لئے ان الفاظ کے علاوہ لفظ "امت" بھی آیا ہے یا نہیں؟ کیا ان الفاظ کے معانی میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ہی قوم اس اختلاف معانی کی بنا پر ایسی مختلف حیثیتیں رکھے کہ دینی یا شرعی اعتبار سے تو وہ نوامیس الٰہیہ کی پابند ہو۔ اور ملکی اور وطنی اعتبار سے کسی ایسے دستور العمل کی۔ جو ملی دستور العمل سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا قرآن سے استشہاد کرتے تو اس مسئلہ کا حل خود بخود ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ آپ نے الفاظ کی جو لغت بیان فرمائی۔ وہ بہت حد تک درست ہے، قوم کے معنی جماعۃ الرّجال فی الاصل دون النساء ہے۔ گویا لغوی اعتبار سے عورتیں قوم میں شامل نہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں جہاں قوم موسیٰ اور قوم عاد کے الفاظ آتے ہیں۔ وہاں ظاہر ہے کہ عورتیں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ "ملت" کے معنی بھی دین و شریعت کے ہیں۔

اہم سوال

لیکن سوال ان دونوں لفظوں کے لغوی معانی کے فرق کا نہیں۔ سوال یہ ہے۔ کہ کیا مسلمان اوّلاً۔ اجتماعی اعتبار سے واحد و متحد اور معروف جماعت ہیں جس کی اساس توحید اور ختم نبوت پر ہے، یا کوئی ایسی جماعت ہیں جو نسل و ملک، یا رنگ و زبان اُن کے مقتضیات کے ماتحت اپنی ملّی وحدت چھوڑ کر کسی اور نظام و قانون کے ماتحت کوئی اور ہیئتِ اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں؟

ثانیاً کیا ان معنوں میں بھی قرآنِ حکیم نے اپنی آیات میں انہیں لفظ "قوم" سے تعبیر کیا ہے؟ یا صرف لفظ ملّت یا اُمّت ہی سے پکارا گیا ہے۔

ثالثاً اس ضمن میں وحی الٰہی کی دعوت کس لفظ کے ساتھ ہے؟ کیا یہ کسی آیت قرآنی میں آیا ہے کہ اے لوگو! یا اے مومنو! "قوم مسلم" میں شامل ہو جاؤ۔ یا اس کا اتباع کرو۔ یا یہ دعوت صرف ملّت کے اتباع اور اُمّت میں شمولیت کی ہے؟

قرآن کریم میں ملّت کا مفہوم

جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں "اتباع" و شرکت کی دعوت ہے، وہاں صرف لفظِ ملّت یا اُمّت وارد ہوا ہے۔ کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے ـــ

ومن احسن دیناً ممن اسلم وجھہٗ للّٰہ وھو محسن واتبع ملۃ ابرٰھیم حنیفا۔ واتبعت ملۃ اٰبائی ابرٰھیم۔ فاتبعوا ملّۃ ابرٰھیم حنیفا۔

اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لئے ہے کہ "ملّت" نام ہے ایک دین کا۔ ایک شرع و منہاج کا۔ "قوم" چونکہ کوئی شرع و دین نہیں۔ اس لئے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب عبث ہے کوئی گروہ ہو۔ خواہ وہ قبیلہ کا ہو۔ نسل کا ہو۔ ڈاکوؤں کا ہو۔ تاجروں کا ہو۔ ایک شہر والوں کا ہو۔ جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو۔ وہ محض گروہ ہے، رجال کا یا انسانوں کا۔ وحی الٰہی یا نبی کے نقطۂ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر وحی یا نبی اس گروہ میں آئے تو وہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے اس لئے اس کی طرف منسوب بھی ہوتا ہے، مثلاً قوم نوحؑ۔ قوم موسےٰؑ۔ قوم لوطؑ۔ لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدر کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو وہ اس کی طرف بھی منسوب ہو گا۔ مثلاً قوم عاد۔ قوم فرعون۔ اگر ایک ملک میں دو گروہ اکھٹے ہو جائیں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں۔ تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں، مثلاً جہاں قوم موسےٰؑ تھی وہاں قوم فرعون بھی تھی۔ قال الملاء من قوم فرعون اتذر موسیٰ وقومہ۔ لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا وہاں وہ گروہ عبارت تھا۔ جو ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا۔ جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آتے گئے توحید کو تسلیم کرتے گئے۔

وہ اس پیغمبر کی ملت میں آگئے۔ اس کے دین میں آگئے یا واضح ترمعنوں میں مسلم ہوگئے۔ یاد رہے کہ دین ملت کفار کی بھی ہوسکتی ہے۔ اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّۃَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ۔

ایک قوم کی ایک ملت یا اس کا منہاج تو ہوسکتا ہے۔ لیکن ملت کی قوم کہیں نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام و ملل سے نکل کر ملتِ ابراہیمی میں داخل ہوگئے۔ ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا "امت" کے لفظ سے۔

ان گزارشات سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم میں مسلمانوں کے لئے سوائے "امت" کے اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اگر کہیں آیا تو ارشاد فرمائیے۔ "قوم" رِجَال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت بہ اعتبار قبیلہ۔ نسل۔ رنگ۔ زبان۔ وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ لیکن "ملت" سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بناتی ہے۔ گویا ملت یا اُمت جاذب ہے اقوام کی۔ خود ان میں جذب نہیں ہوسکتی۔

کانگریسی علماء کی مجبوریاں

عصرِ حاضر کے ہندوستانی علماء کو حالاتِ زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو قرآن یا نبیٔ اُمّی کا منشا ہرگز نہ ہوسکتی تھیں۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے جن کی وحی میں قوموں نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔ نوعِ آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی۔ موحد و مشرک۔ اس وقت سے لے کر دو ہی ملتیں اس دنیا میں ہیں۔ تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمی اور دعوتِ اسمٰعیلی سے غافل ہوگئے۔ قوم اور "قومیت" کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ۔

اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ

کیا خدا کی بارگاہ سے امتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئتِ اجتماعی کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی۔ افغانی۔ انگریزی۔ مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہوسکتا۔ امتِ مسلمہ کے مقابلہ میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کی ہے۔

امتِ مسلمہ جس دینِ فطرت کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیّمہ ہے۔ دینِ قیّمہ کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے۔ اور وہ یہ کہ دین ہی مقوم ہے۔ اس گروہ کے امورِ معاشی اور معادی کا جو اپنی انفرادی

اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کردے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن کی رُو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو، نامقبول و مردود ہے۔

قریشِ مکہ سے جنگ کیوں؟

ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کے لئے قابلِ غور ہے۔ کہ اگر "وطنیت" کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب۔ ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملّت سمجھ کر بلحاظِ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپناتے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے، بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریشِ مکہ کا بھی تھا۔ مگر افسوس کہ آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبرِ خدا کے نزدیک اسلام۔ دینِ قیم اور امتِ مسلمہ کی آزادی مقصود تھی ـ ان کو چھوڑ کر یا ان کو کسی دوسری ہیئتِ اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجہل اور ابولہب امتِ مسلمہ کو ہی آزادی سے پھولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کہ بطور مدافعت ان سے نزاع درپیش آئی۔ محمدؐ (فداہ ابی و امی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی۔ اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بننے لگی۔ تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی متابعت میں آگئے۔ وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے، یا دیگر اقوام سے وہ سب امتِ مسلمہ یا ملّتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملکؔ و نسب کے گرفتار رہتے، اب ملکؔ و نسب ان کا گرفتار ہو گیا ؎

کسے کہ پنجہ زد ملک و نسب را   نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ   نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را

مقامِ محمدیؐ اور وحدتِ عربیہ

حضورِ رسالت مآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے، لیکن اگر حضورؐ نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ نبی آخر الزمان کی راہ نہ ہوتی۔ نبوتِ محمدیہؐ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہؐ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ بنی نوعِ انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل

اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے۔ جو مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں "ابدیت" سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدی، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے معلوم نہیں حضرت انسان کو کتنی صدیاں لگیں۔

اسلام کا بے مثال کارنامہ

مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اسلام نے اقوام عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی۔ قبائلی۔ نسلی۔ قومی اور انسانی امتیازات کے ان کو یک رنگ کرنے میں جو کام تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانئے دین اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس جہاتیاتی، اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلم عظیم ہے بنی نوع انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

نظریۂ وطنیت کی ذہنی افتاد

مولانا حسین احمدؒ کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ نے مدبرانہ احسان سے اس بات کی تائید میں نص طلب کی ہے کہ "ملتِ اسلامیہ شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر موسس ہے" بہتوں سے مسلمانوں کے لئے تعجب خیز ہوگا۔ لیکن میرے لئے چنداں تعجب خیز نہیں۔ اس لئے کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی۔ جب کسی مسلمان کے دل و دماغ پر وطنیت کا وہ نظریہ غالب آجائے جس کی دعوت مولانا دے رہے ہیں، تو اسلام کی اساس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ وطنیت سے قدرتاً افکار حرکت کرتے ہیں اس خیال کی طرف کہ بنی نوع انسان اقوام میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا نوعی اتحاد امکان سے خارج ہے۔ اس دوسری گمراہی سے جو وطنیت سے پیدا ہوتی ہے" ادیان کی اضافیت" کی لعنت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ تصور کہ ہر ملک کا دین اس ملک کے لئے خاص ہے، اور دوسری اقوام کے طبائع کے موافق نہیں۔ اس تیسری گمراہی کا نتیجہ سوائے لادینی اور دہریت کے اور کچھ نہیں۔

"شرفِ انسانی" کا مفہوم

یہ ہے نفسیاتی تجزیہ اس تیرہ بخت مسلمان کا جو اس روحانی جذام میں گرفتار ہو جائے۔ باقی رہا نص کا معاملہ میں سمجھتا ہوں۔ کہ تمام قرآن ہی اس کے لئے نص ہے، الفاظ شرف انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیئے، اسلامیات میں

ان سے مراد وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جو حضرتِ انسان کے قلب وضمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرۃ اللہ سے ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے اس تڑپ پر جو توحید الٰہی کے لئے اس کے رگ و ریشے میں مرکوز ہے۔ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزیوں کا۔ خونریزیوں کا۔ اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے، جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو۔ قرآن کا جواب ہے۔ کہ ہاں ہو سکتی ہے، بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشائے الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبر کا کرشمہ نہ سمجھئے۔ بلکہ یہ رحمت العالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور تفضیلتوں سے پاک کرکے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو "اُمّۃً مسلمۃً لک" کہہ سکیں۔ اور اس کے فکر و عمل پر "شھداء علی الناس" کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔"

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

(بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت ماہ مارچ ۱۹۷۱ء)

حسب ذیل عطیات بہ تشکر موصول ہوئے۔

۱۔	محترم ظہور الدین بھٹی صاحب	لاہور	-/۵
۲۔	" محمد شریف میر صاحب	"	-/۵
۳۔	" عبدالرحمٰن صاحب	"	-/۲
۴۔	" بشیر احمد صاحب	ملکوال	-/۵
۵۔	محترمہ ایس۔ ایس۔ بٹ صاحب	اسلام آباد	-/۱۰۰
۶۔	محترم تصور حسین صاحب	خانیوال	-/۵۰

نوٹ :۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس آر۔ او نمبر ۲۸/۲۸ (K) ۲۵۴ مورخہ ۴۶-۴-۲ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ I مورخہ ۴۸-۳-۱۳ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۵/۱۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں

(سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) لاہور)

بابُ المراسلات

کیا طالب علموں کو سیاست میں حصّہ لینا چاہئیے؟

کچھ عرصہ سے ہمارے پاس اس قسم کے استفسارات بڑی کثرت سے آرہے ہیں۔ جن میں دریافت طلب امر (بالواسطہ یا بلاواسطہ) یہ ہوتا ہے کہ سٹوڈنٹس (طالبعلم) کو سیاست میں حصہ لینا چاہئیے یا نہیں۔ ان استفسارات کی اہمیت سے قطع نظر، طلوعِ اسلام کو اپنے یومِ آغاز سے، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سے جو قلبی اور خصوصی تعلق چلا آرہا ہے، اس کا تقاضا بھی ہے کہ اس سوال پر اس سنجیدگی سے غور کیا جائے جس کا یہ متقاضی ہے۔ اس لئے کہ آج کا طالب العلم کل کی قوم کا باشعور طبقہ قرار پاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس سے متعلق مسائل کو خصوصی توجہ کا مرکز قرار دیا جائے، طلوعِ اسلام کی زندگی کا اولین مشن ہی یہ ہے۔

"طالب العلم" کے معنی واضح ہیں۔ علم کی طلب وجستجو کرنے والا۔ علم حاصل کرنے والا۔ جہاں تک انگریزی لفظ (STUDENT) کا تعلق ہے۔ اس کے معنی ہیں (STUDY) کرنے والا اور لفظ (STUDY) کے معنی ہیں پیشِ نظر مقصد میں پورے جذب وانہماک سے معروف رہنے والا۔ لہٰذا طالب العلم یا سٹوڈنٹ سے مراد ہوگی وہ طبقہ جو حصولِ علم میں کامل جذب و انہماک سے معروف رہے۔ اس ابتدائی تشریح ہی سے واضح ہے کہ اگر طالب علم کے پیشِ نظر حصولِ علم کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو۔ یا اس کی توجہ کسی دوسری طرف منعطف ہو جائے یا بٹ جائے، تو اسے طالب العلم یا سٹوڈنٹ کہا ہی نہیں جائے گا۔

اب آیئے اس موضوع کے دوسرے جزو کی طرف، اور یہ دیکھئے کہ "سیاست میں حصہ لینے" سے مراد کیا ہے؟ اس کے لئے آپ گذشتہ دو چار سال کے حالات کو سامنے لایئے۔ ان سے اس سوال کا جواب آپ کو خود بخود مل جائے گا۔ ہمارے ہاں سیاست کا مفہوم رہ گیا ہے ہنگامہ آرائی۔ جو جماعت، یا پارٹی ہنگامے برپا نہیں کراتی، میدانِ سیاست میں اسے کچھ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سب سے بڑا لیڈر اسے سمجھا جاتا ہے جو سب سے زیادہ ہنگامے برپا کرا سکے۔ لیڈر ہنگامہ برپا کرتا نہیں، ہنگامے برپا کرا لیتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہنگامے برپا کرانے کے لئے اسے ایسے عنصر کی ضرورت ہوتی ہے جو بے خطر آگ میں کود پڑے

بے خطر آگ میں وہی لوگ کود سکتے ہیں جنہیں ذمہ داریوں کی زنجیر پیچھے سے نہ کھینچ رہی ہو۔ اس قسم کا ذمہ داریوں سے آزاد طبقہ طالب علموں سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا۔ ان کی ذمہ داریاں، ان کے والدین یا سرپرست پوری کرتے ہیں۔ اور یہ ہنوز عمر کے اس حصے میں داخل نہیں ہوتے جہاں دوسروں کی ذمہ داریاں پوری کرنا، ان کے فرائض سے ہو۔ حصولِ علم ان کی ایک ہی ذمہ داری ہوتی ہے۔ جب اس ذمہ داری کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو ہنگامہ برپا کرانے کے لئے ان سے زیادہ موزوں طبقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس راز کو سب سے پہلے امیر جماعت اسلامی مودودی صاحب نے سمجھا ــــ وہ اس راز کو سمجھے ہوئے تو بہت پہلے سے تھے۔ انہوں نے سیاست سیکھی ہی فاشزم اور نازی ازم کی تحریکوں سے تھی۔ لہٰذا یوں کہئے کہ پاکستان میں سب سے پہلے انہوں نے اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ اس سے ان کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ اس سے خود انہیں اس قسم کی قوت حاصل ہو جائے گی جس سے وہ دوسروں کو ڈرا دھمکا سکیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس طرح پاکستان میں ایک ایسی قوم تشکیل پذیر ہوتی جائے گی جو قانون شکنی اور سرکشی کی عادی ہی نہیں بلکہ اس میں فخر محسوس کرے۔ تاکہ یہاں کسی حکومت کی نظم و نسق کی مشینری سکون و اطمینان سے چلنے نہ پائے۔ اور وہ زمامِ اقتدار ان کے (مودودی صاحب کے) ہاتھ میں دینے پر مجبور ہو جائیں۔ اور یا اگر ایسا نہ کریں، تو پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہو سکے۔ اس کے بعد ملک کی دوسری پارٹیوں نے بھی یہی کچھ کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے کہ فریقِ مخالف سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہر پارٹی کو قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب قوت کا ذخیرہ طالب علم ہوں تو ہر فریق اسے زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی کوشش کرے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ گذشتہ کچھ عرصہ میں ملک میں جس قدر شعلہ آمیز تحریکات اٹھی ہیں اور جس قدر ہنگامے برپا ہوئے ہیں۔ ان میں (عوام کے اس طبقہ کو چھوڑ کر جو ان ہنگاموں میں لوٹ مار کی غرض سے شریک ہو جاتا ہے) سب سے زیادہ حصہ طالب علموں نے لیا ہے۔ آپ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیکھئے۔ جتنی سیاسی پارٹیاں ملک میں ہوتی ہیں۔ اتنی ہی (بلکہ بعض اوقات ان سے بھی زیادہ) پارٹیوں میں طالب علم بٹے ہوئے ہیں۔ اور (بیرونی ہنگاموں کے علاوہ) وہ باہمی کشمکش اور اندرونی ہنگامہ آرائیوں میں مسلسل مصروف رہتے ہیں۔

ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا وہ اپنے بنیادی مقصد ــ یعنی طلبِ علم ــ کی طرف ذرا سی توجہ بھی دے سکتے ہیں؟ اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے آپ کسی کالج یا یونیورسٹی کے کسی شعبہ میں جائیے۔ اور معلوم کیجئے کہ وہ درسگاہ سال بھر میں کتنے دن کھلی رہی، اور کتنے دن بند۔ جتنے دن بند رہی، ان میں سے کتنے دنوں کے لئے انتظامیہ نے اسے بطیبِ خاطر بند کیا۔ اور کتنے دنوں کے لئے علم کے طالبوں نے انہیں، اپنی شوریدہ سری کی بنا پر اسے بند رکھنے پر مجبور کیا۔ پھر جتنے دنوں کے لئے وہ درسگاہ کھلی رہی۔ ان میں سے کتنے دنوں پوری کلاس نے لیکچروں میں

حاضری دی۔ اور جب حاضری دی تو طالب علموں نے کتنی باتیں استاد کی سنیں اور اسے کتنی اپنی باتیں سننے پر مجبور کیا۔ کتنے دن ہنگامے برپا کئے۔ اور ان ہنگاموں میں ان درسگاہوں کا کس قدر نقصان ہوا۔ اس جائزہ سے آپ کو ان طالب علموں کی علم کے لئے طلب و تلاش کا اندازہ ہو جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس سے پہلے بھی درسگاہوں میں بعض کھلنڈرے قسم کے طالب علم ہوا کرتے تھے۔ لیکن امتحانات کے نتائج انہیں رک کر، سوچنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے کہ انہوں نے طلب علم کا مقصد کس حد تک حاصل کیا۔ اور وقت کس قدر ضائع کیا۔ لیکن اب سیاست میں حصہ لینے والے ہمارے ان طالب علموں کے نزدیک نہ امتحان کی کوئی اہمیت رہ گئی ہے نہ ان کے نتائج کی کوئی وقعت۔ انہیں چونکہ سکھا دیا گیا ہے کہ مقصد صرف ڈنڈے کے زور پر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ سندات بھی اسی طریق سے حاصل کرتے ہیں۔ جی چاہا امتحان میں بیٹھے اور جی چاہا نہ بیٹھے۔ جب بیٹھے بھی تو جتنا وقت جی چاہا بیٹھے۔ جب جی میں آیا اٹھ کر چلے آئے۔ کمرۂ امتحان میں جس قسم کی خلاف قانون حرکت چاہی کی۔ محتسب اور نگران بیچارے کی کیا مجال جو انہیں ٹوک سکے۔ اگر کسی نے شامت اعمال سے ایسا کر دیا تو پھر نہ اس کی عزت محفوظ ہے نہ جان۔ پرچے ممتحن کے پاس پہنچے تو وہ جان چھپاتے پھر رہا ہے کہ معلوم کیا ہو۔ کہیں دھمکیوں سے پرچے بدلے کہیں اپنی مرضی کے مطابق نمبر لکھوائے۔

نتیجہ مرتب ہوا تو راست اقدام شروع کر دیا۔ کہ پرچے سخت تھے۔ اتنے نمبر بہ ہیئت مجموعی بڑھاؤ۔ نہیں بڑھاتے تو ہم کالج کو آگ لگا دیں گے۔ یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

یہ ہے نتیجہ ہمارے طالب علموں کے سیاست میں حصہ لینے کا۔ اس کے بعد ہم اپنے مستفسرین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اس سوال کے جواب کے لئے کسی ارسطو کے دماغ کی ضرورت ہے کہ طالب علموں کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے یا نہیں۔

لیکن اس صورت حال کی ذمہ داری کلیتہً ان نوجوانوں پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ عمر سبز شاخ کی سی ہوتی ہے کہ اسے جس طرف جھکاؤ وہ جھک جاتی ہے۔ اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہمارے لیڈران کرام پر جو محض اپنے ذاتی مقاصد کی خاطر ملت کی اس قدر بے بہا متاع کو اس بیدردی سے لوٹتے اور بے رحمی سے ضائع کرتے ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ اس کے بعد قوم کے سر احسان بھی دھرتے ہیں۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا۔ کہ موسیٰ تم بڑے احسان فراموش ہو۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ تمہارا احسان یہی ہے ناں کہ تم بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرتے ہو۔ فرعون تو دوسری قوم کے بچوں کو ذبح کرتا تھا۔ ہمارے یہ لیڈران کرام خود اپنی قوم کے بچوں کو ذبح کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اس کے لئے ان کی شان میں قصیدے پڑھے جائیں۔

ان حضرات سے تو کچھ کہنا بے کار ہے۔ لیکن ہم اپنے ان عزیز از جان، نونہالانِ ملت سے، دل کے پورے سوز اور جگر کے کامل گداز کے ساتھ کہیں گے۔ کہ وہ کسی وقت ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ یہ لوگ انہیں کس بُری طرح (EXPLOIT) کر رہے ہیں۔ اور اس کی انہیں کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ انسان کا شرف علم سے ہے اور علم حاصل کرنے کا یہی زمانہ ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کسی نہ کسی طرح ڈگریاں حاصل کر لیں۔ لیکن ڈگری اور علم میں تو بڑا فرق ہوتا ہے۔ ڈگری، ڈبے کے باہر اس شے کا نام ہوتا ہے جو اس ڈبے میں بند ہو۔ اگر ڈبہ اندر سے خالی ہو تو اس کے باہر لکھے ہوئے نام کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اس وقت تو آپ اس کا احساس نہیں کرتے لیکن عمر کے اگلے مرحلہ میں جب آپ محسوس کریں گے۔ کہ آپ علم سے کس قدر بے بہرہ رہ گئے تو آپ کو عمر بھر اس کا افسوس رہے گا۔ لیکن اس نقصان کی تلافی کسی صورت بھی نہ ہو سکے گی۔ علم اپنا ایک وزن رکھتا ہے ایک لذت رکھتا ہے۔ ایک کیف رکھتا ہے۔ اس سے شعورِ خویش اور خود اعتمادی کی ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا بدل کچھ اور نہیں۔ اگر آپ اس کیفیت سے محروم رہ گئے تو یہ خلا کسی طرح سے پُر نہیں ہو سکیگا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جس طبقے نے کل کو قوم بننا ہے اس کے لئے قوم کے معاملات سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ ہم بھی اس سے متفق ہیں۔ لیکن اس واقفیت کے لئے سیاست کا علم حاصل کرنا ضروری ہے نہ کہ سیاسی ہنگاموں کے بگولوں کا خس و خاشاک بننا۔ جن طالب علموں نے اس علم میں تخصیص حاصل کرنی ہو، وہ پولیٹیکل سائنس کو بطور ایک مضمون کے منتخب کر لیں۔ باقی طالب علم، سیاست کے مبادیات سے متعلق کسی کتاب کا مطالعہ کریں۔ اخبار دیکھیں۔ مقالات لکھیں۔ مذاکرات میں حصہ لیں لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ :-

(۱) آپ نہ کسی سیاسی پارٹی کا ساتھ دیں، نہ خود کوئی پارٹی بنائیں۔

(۲) علم سیاست محض نظری طور پر حاصل کریں۔ اور عملی سیاسیات میں کبھی حصہ نہ لیں۔

(۳) اپنے ملک کی سیاست کا خاموش مطالعہ کریں۔ اسے نہ تو مقالات میں اور نہ ہی مذاکرات میں، بحث و گفتگو کا موضوع بنائیں۔ اپنے ملک کی سیاست کو موضوع بحث قرار دینے سے آپ کو لازماً (SIDES) لینی پڑیں گی۔ اور اس سے پارٹی بازی کا آغاز ہو جائے گا۔

——اور اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کریں۔ کہ آپ طالب العلم ہیں۔ آپ کا فریضہ علم کی طلب و جستجو ہے۔ اور بس —— دنیا کی کوئی کشش جو آپ کی توجہات کو اس مقصد سے برگشتہ کرنے کا موجب بنتی ہے۔ آپ کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔

شاہد عادل

اسلامی ریاست میں زمین کی ملکیت

جیسا کہ طلوع اسلام میں بکثرت لکھا جا چکا ہے، زمین انسانوں کی پرورش کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اسلامی مملکت کی تحویل میں رہتی ہے تاکہ وہ اس سے رزق حاصل کرنے کا اطمینان بخش انتظام کرے۔ اس انتظام کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں اور ان میں ضروریات کے مطابق تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود اصل حقیقت اپنی جگہ اٹل رہتی ہے کہ زمین کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جا سکتی۔ یعنی کہ مملکت کی ملکیت میں بھی نہیں۔ طلوع اسلام کے قابل احترام قلم کار "شاہد عادل" نے اپنے مخصوص انداز کے مطابق اس مسئلہ پر تحقیق کی ہے کہ عہد رسالتؐ، زمانہ خلافت راشدہؓ اور بعد کے مسلمانوں کے حکومتوں نے انتظاماتِ اراضی کی کیا شکلیں رہی ہیں۔ امید ہے قارئین ان کی اس تحقیق کا بنظر تعمق مطالعہ کریں گے۔ (طلوع اسلام)

پچھلے عام انتخابات میں کوئی دو درجن سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا ہوگا۔ یہ سب کی سب جماعتیں اسلامی نظام کے قیام کا دعویٰ لے کر اٹھیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کی قیادت علمائے دین کے ہاتھ میں تھی۔ ان جماعتوں نے اپنے اپنے منشور شائع کئے۔ اس مجلس میں ہم چونکہ مسئلہ زمین پر بات کرنا چاہتے ہیں اس لئے صرف اسی مسئلہ کی تفصیلات کو سامنے لائیں گے۔ ان مختلف جماعتوں نے ملکیتِ زمین کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا جو نقطۂ نظر پیش کیا وہ کم و بیش ملتا جلتا تھا یعنی یہ کہ اس کی ملکیت کی حد مقرر کر دی جائے گی۔ بعض کے نزدیک یہ حد ایک سو ایکڑ تھی کسی کے نزدیک ڈیڑھ صد اور کوئی دو سو ایکڑ کا نعرہ لگا رہا تھا۔ ان تمام نقطہ ہائے نظر کو نقل کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔ اس لئے ہم صرف ایک ایسی جماعت کا مسلک نقل کئے دیتے ہیں جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ منظم اور روشن خیال ہے۔ یہ جماعت اسلامی ہے جس کے منشور میں حدِ ملکیت کے بارے میں یہ شرعی حکم پیش کیا گیا۔

"مغربی پاکستان کے زرخیز علاقوں میں یہ حد زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے سو (۱۰۰) اور دو سو (۲۰۰) ایکڑ کے درمیان ہوگی اور جن علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت کم ہے وہاں اس معیار کے لحاظ سے حد مقرر کی جائے گی"　(منشور جماعت اسلامی پاکستان ص۲۳)

غیر محدود ملکیت اور حد بندی

ہم یہاں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ یہی جماعت اس سے پہلے ملکیت پر کسی قسم کی حد مقرر کرنے کو غیر اسلامی قرار دیتی رہی ہے۔ آئندہ سطور میں ہم صرف یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ مختلف جماعتوں کی جانب سے جو ایکڑوں کی حد لگائی گئی ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ کہ مختلف اسلامی ادوار میں زمین کی ملکیت کے بارے میں کن شرعی احکام پر عمل ہوتا رہا ہے۔

ملوکیت بھی اثر انداز نہ ہو سکی

خلافت راشدہ کے بعد امت مسلمہ کو ملوکیت سے واسطہ پڑا۔ ملوکیت کے کچھ مفادات تھے جس کی وجہ سے وہ وقتاً فوقتاً شرعی احکامات پر اثر انداز ہوتی رہی۔ اس مسئلہ پر بھی اس نے اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ یہ مسئلہ صرف نظریاتی نہیں بلکہ سو فیصدی عملی تھا، اس لئے ملوکیت کا اثر دیرپا نہ ہوا۔ اسلئے کم و بیش تمام تاریخی ادوار میں انہی شرعی احکامات پر عمل ہوتا رہا، جو صدر اول میں مروج ہوتے تھے۔ یہ تفصیلات آگے آتی ہیں۔

اہل عرب کی زمینیں

مسئلہ ملکیت زمین کے سلسلے میں ہماری فقہ کی کتابوں میں دو اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ ایک عشری جس سے مراد ذاتی ملکیت کی زمینیں لی جاتی ہیں۔ اور دوسری خراجی جس کا اطلاق ریاست کی زمینوں پر ہوتا ہے۔ اول الذکر اصطلاح سے عام طور پر اہل عرب کی زمینیں مراد لی جاتی تھیں جبکہ موخر الذکر اصطلاح سواد کی زمینوں کے لئے بولی جاتی۔ یعنی وہ زمینیں جو مسلمانوں نے جزیرہ عرب سے باہر فتح کیں۔ اگرچہ ہمارے ملک کی زمینیں دوسری شق کے تحت آتی ہیں، لیکن ہم مختصراً اہل عرب کی زمینوں کے بارے میں شرعی احکام بھی سامنے لانے جائینگے جن سے معلوم ہوگا کہ عشری اور خراجی زمینوں کی ملکیت کی نوعیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔

اراضی مدینہ

اسلامی حکومت کے قیام کے وقت زیادہ تر زرعی اراضی اہل مدینہ کے پاس تھیں یہ لوگ عام طور پر اپنی زمینیں نصف بٹائی پر کاشت کے لئے دوسرے کاشتکاروں کو دے دیا کرتے تھے۔ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد حضور صلعم نے اہل مدینہ کو ایسا کرنے سے منع کر دیا اور بٹائی کے معاملہ کو واضح الفاظ میں سود قرار دے دیا۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہاں صرف دو فرمان نبوی نقل کرنے پر اکتفا کرینگے۔

بٹائی کا معاملہ سود ہے

عن ابن ابی نعیم حدثنی رافع ابن خدیج انہٗ زرعَ ارضاً فمرّ بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یسقیہا۔ فسالہ لمن

الزرع ونصف الارض۔ فقال زرعی ببذری وعملی۔ لی الشطر ولبنی فلان الشطر۔ فقال اربیتما۔ فرد الارض علی اھلھا وخذ نفقتک۔ (سنن ابوداؤد مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۲۵۵)

ابن ابی نعیم سے روایت ہے کہ مجھ سے رافع بن خدیج نے بیان کیا کہ اس نے ایک زمین کاشت کی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے اور وہ کھیتی کو پانی دے رہا تھا۔ تو آپ نے پوچھا کہ یہ زمین اور کھیتی کس کی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ بیج اور کام کی شرط پر یہ کھیتی میری ہے۔ اس میں ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک بنی فلاں کا۔ تو آپ نے فرمایا کہ آپ دونوں نے سود کا معاملہ کیا۔ زمین مالکوں کو واپس کر دو اور ان سے اپنے اخراجات لے لو۔

دوسری حدیث میں تو آپ نے اس بٹائی کے معاملے کو نہ صرف یہ کہ سود قرار دیا بلکہ بڑی سختی سے منع بھی فرمایا:۔

عن جابر بن عبداللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من لم یذر المخابرۃ فلیاذن بحرب من اللہ ورسولہ (ایضاً)

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص بٹائی چھوڑنے پر تیار نہیں وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لئے تیار ہو جائے۔

عشری زمین بیچنے کی بھی اجازت نہیں

ہمارے علماء تو عشری زمینوں کو ذاتی ملکیت قرار دے کر اس کی خرید و فروخت کی اجازت دیتے ہیں لیکن حضور صلعم نے اس بارے میں جو حکم دیا تھا اس سے اس کی مطلق گنجائش نہیں نکلتی۔ آپ نے جب بٹائی کے معاملے کو سود قرار دیکر اسے منع فرمادیا تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ مالکان اراضی کے پاس ان کی ضروریات سے زاید جو فاضل زمینیں ہیں کیا وہ ان فاضل زمینوں کو بیچ سکتے ہیں۔ یہ معاملہ بار بار حضور صلعم کی خدمت میں پیش ہوا لیکن آپ نے واضح الفاظ میں ہر بار اس کی فروخت سے منع فرمادیا۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت جابرؓ سے یہ روایت بیان کی ہے:۔

کان رجال من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضول ارضین۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ ارض فلیزرعھا او یمنحھا اخاہ۔ فان ابی فلیمسک ارضہ۔ رواہ البخاری (بحوالہ نیل الاوطار از علامہ شوکانی جلد ۵ صفحہ ۲۹۵)

بعض اصحاب رسول صلعم کے پاس فاضل زمین تھی۔ آپ نے فرمایا کہ جن کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو بخشش دے۔ اور اگر ایسا کرنے سے ابا کرے تو پھر اپنی زمین اپنے پاس رکھے یعنی وہ بیچ نہیں سکتا۔)

آخری فقرے میں آپکی ناپسندیدگی ملاحظہ ہو۔ یعنی بار بار کے سوال کرنے پر بھی آپ نے فاضل زمین کو بیچنے کی اجازت نہ دی۔

رہائشی زمین بھی ریاست کی ملکیت ہے،

زمین فروخت نہ کرنے کا یہ شرعی حکم زرعی اراضی تک محدود نہ تھا۔ بلکہ رہائشی زمینوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ یعنی ان کی فروخت کی بھی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی شخص اپنا مکان فروخت کرنا چاہتا تو وہ صرف اس کا ملبہ فروخت کرنے کا حق رکھتا تھا نہ کہ زمین۔ عام بستیوں میں تو مکانات کے لیئے زمین کی فروخت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ زمین کی کمی نہیں تھی (آج بھی ہمارے ملک میں اکثر دیہات میں مکانات کی زمین مفت مل جاتی ہے) لیکن جو شہر بڑے یا مشہور تھے وہاں رہائشی مکانوں اور زمینوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ مکہ معظمہ کو تو ویسے بھی حجاج اور تجارتی قافلوں کی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی چنانچہ حضور صلعم نے ان الفاظ میں ان زمینوں کے بیچنے سے منع فرما دیا:۔

عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکۃ مناخ لا تباع رباعها ولا تواجر بیوتها۔ (احکام القرآن للجصاص۔ جلد ۳ صفحہ ۲۵۲)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مکہ معظمہ قافلوں کی آماجگاہ ہے۔ اس کے مکان نہ بیچے جا سکتے ہیں اور نہ ہی کرائے پر دیئے جا سکتے ہیں۔

یہاں پر مکانوں سے مراد مکانوں کی زمین ہے جیسا کہ اسی کتاب کے اگلے صفحے پر حضرت امام ابوحنیفہ رح کے فتوے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی

وقال ابوحنیفۃ لا باس ببیع بناء بیوت مکۃ و اکرہ بیع اراضیها۔ (ایضاً)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ مکہ معظمہ کے مکانوں کے ملبہ (یعنی زمین کے علاوہ لکڑی عمارت وغیرہ) کی فروخت میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ اسکی زمین بیچنا ناپسندیدہ ہے۔

بعد کی اسلامی حکومتوں میں جو بھی بڑے بڑے شہر آباد ہوئے، ان میں انہی احکامات کے مطابق رہائشی مکانات خریدنے یا فروخت کرنے کی اجازت نہیں تھی ان کی تفصیلات آگے آتی ہیں۔

غیر عرب زمینیں یا اراضی سواد

یہ تو تھی اہل عرب کی اراضی کی (جسے اصطلاح میں عشری کہا جاتا ہے) شرعی حیثیت۔ اب ہم غیر عرب زمینوں کو لیتے ہیں جنہیں اراضی سواد اور خراجی زمینیں بھی کہا جاتا ہے۔ عراق کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے ان زمینوں کو صحابہ کرامؓ کے مشورے سے ریاست کی ملکیت قرار دیا تھا۔ بہتر ہوگا کہ اس تاریخی فیصلے کو انہی کی زبانی پیش کیا جائے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

وقد غنمنا اللہ اموالهم وارضهم وعلوجهم۔ فقسمت ما غنموا من اموال بین اهله واخرجت الخمس فوجهته علی وجهه و انا فی توجیهه وقد

لٰکِنّی رأیت ان احبس الارضین بعلوجها واضع علیهم فیها الخراج وفی رقابهم الجزیة یؤدونها فتکون فیئاً للمسلمین. (کتاب الخراج مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵)

اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال، زمینیں اور کاشتکار ہمیں بطور غنیمت عطا کر دیئے ہیں تو ان لوگوں کو غنیمت میں جو مال ملا تھا، میں نے اسے مستحقین میں تقسیم کر دیا ہے اور پانچواں حصہ نکال کر اسے اس کے متعینہ مصارف میں تقسیم کر دیا ہے، بلکہ ابھی تک اس کی تقسیم میں مصروف ہوں. میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ زمینوں کو مع کاشتکاروں کے سرکاری ملکیت قرار دے دوں اور اسکے کاشتکاروں پر خراج عاید کروں۔ اور ان پر فی کس جزیہ مقرر کر دوں جسے وہ ادا کرتے رہیں اور یہ مسلمانوں کے لئے مالِ فئی ہوگا.

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی کے مطابق عمل کیا اور بعد کے خلفائے راشدینؓ اور سلاطینِ اسلام نے بھی. یہ زمینیں اگرچہ اسلامی ریاست کی ملکیت قرار دی گئی تھیں، لیکن ان پر تابض کاشتکاروں کو ایسے حقوق حاصل تھے جو ملکیت سے ملتے جلتے تھے. اور یہ اراضی ان کاشتکاروں میں نسلاً بعد نسل چلتی تھی اور خود حکومت انہیں بے دخل نہیں کر سکتی تھی. تاہم وہ اسے بیچ نہیں سکتے تھے. اس لئے جب وہ نقلِ مکانی کرنا چاہتے تو وہ زمین پھر سے ریاست کی ملکیت ہو جاتی. حضرت علیؓ کے زمانے میں بعض ایسے کاشتکاروں نے نقلِ مکانی کا ارادہ کیا تو جو زمینیں وہ کاشت کرتے تھے انہیں بیچنا چاہا جب یہ معاملہ حضرت علیؓ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے یہ فیصلہ فرمایا.

عن الزبیر بن عدی قال اسلم دهقان علی عهد علیؓ فقال له علیؓ ان اقمت فی ارضك رفعنا عنك جزیة رأسك واخذناها من ارضك وان تحولت عنها فنحن احق بها. (کتاب الاموال لابی عبید مطبوعہ مصر صفحہ ۸۴)

زبیر بن عدی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں ایک زمیندار نے اسلام قبول کر لیا تو حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ اگر تم اپنی زمین پر قائم رہو گے تو ہم تمہارا جزیہ معاف کر دیں گے لیکن تمہاری زمین سے خراج لیتے رہیں گے اور اگر تم اپنی زمین چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جاؤ گے تو ہم اس زمین کے زیادہ حقدار ہیں (یعنی پھر یہ بیت المال کی ملکیت بن جائیگی)

آپ ہی کا دوسرا فیصلہ ملاحظہ ہو:-

عن محمد بن عبید الله الثقفی ان دهقانا اسلم فقام الی علیؓ فقال له علیؓ اما انت فلا جزیة علیك واما ارضك فلنا. (ایضاً)

محمد بن عبید اللہ الثقفی کہتے ہیں کہ ایک زمیندار نے اسلام قبول کر لیا اور وہ حضرت علیؓ کی خدمت میں پہنچا، تو آپ نے اس سے کہا کہ اب تمہارے اوپر جزیہ تو واجب نہیں لیکن تمہاری زمین ہماری ہے.

مختصر یہ کہ اسلامی ریاست نے جو ان زمینوں کی مالک تھی، ان پر کام کرنے والے کاشتکاروں کو ایسے قابضانہ حقوق دے رکھے تھے جو ملکیت سے ملتے جلتے تھے جس کی وجہ سے بعض دفعہ ان کاشتکاروں کو یہ غلط فہمی بھی پیدا ہو جاتی کہ وہ اس کی خرید و فروخت کے بھی مجاز ہیں لیکن جونہی کوئی ایسا معاملہ حکومت کے نوٹس میں آتا اسے فوراً منسوخ کر دیا جاتا۔

ملکیت زمین کی فقہی حیثیت

ان احکامات کو سامنے رکھ کر ہمارے فقہاء نے اسلامی ریاست کی اراضی کی قانونی حیثیت متعین کر دی جس کے مطابق صدرِ اول سے لیکر عثمانی حکومت کے خاتمے تک یعنی ۱۹۲۴ء تک عمل ہوتا رہا ہے۔ حنفی فقہ کی معتبر ترین کتاب شامی میں اس قانونی حیثیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قال فی ردّالمحتار ثم اعلم ان اراضی بیت المال المسماة باراضی المملکة واراضی الحوز اذا کانت فی ایدی زراعها لا تنزع من ایدیهم ما داموا یؤدون ما علیها ولا تورث عنهم اذا ماتوا ولا یصح بیعهم لها ولکن جری الرسم فی الدولة العثمانیة انّ من مات عن ابن انتقلت لابنه مجاناً والّا فلبیت المال ولو له بنت۔ (شامی لابن عابدین۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۵۵)

ردالمختار میں ہے کہ بیت المال کی اراضی جنہیں اراضی سرکار اور اراضی حوز بھی کہا جاتا ہے جب وہ کاشتکاروں کے قبضہ میں ہوں گی تو وہ جب تک اس کا خراج ادا کرتے رہیں اس سے چھینی نہیں جا سکتی۔ اور اگر وہ مر جائیں تو وہ زمین وراثت میں تقسیم نہ ہوگی اور نہ ہی اس کی خرید و فروخت جائز ہے۔ دولتِ عثمانیہ میں یہ عمل رواج پذیر تھا کہ جو کاشتکار نرینہ اولاد چھوڑ جاتا تو وہ زمین اسے منتقل ہو جاتی اور اگر اس کی صرف بیٹی ہوتی تو وہ زمین بیت المال کو واپس ہو جاتی۔

رہائشی زمین کے قطعات

یہ تو تھی سواد کی زرعی اراضی کی وہ شرعی صورت جس پر تمام اسلامی ادوار میں عمل ہوتا رہا۔ اگرچہ اس پر ملوکیت نے کبھی کبھار اثر ڈالنے کی کوشش کی جس کی تفصیلات ہم ابھی پیش کریں گے۔ لیکن پہلے وہ شرعی احکام سامنے لاتے ہیں جن کے مطابق ملکیتِ اراضی کا مذکورہ بالا حکم صرف زرعی زمینوں تک محدود نہ تھا بلکہ اس کا اطلاق رہائشی قطعات اور زمینوں پر بھی ہوتا تھا یعنی مکانات کے مالکان اپنے مکانوں کو بیچنے کے مجاز نہیں تھے۔ اہل عرب کی زمینوں کی شرعی حیثیت کے ذیل میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ مکہ معظمہ کی رہائشی اراضی کی خرید و فروخت جائز نہیں تھی۔ اب غیر عرب اراضی جسے اصطلاح میں اراضی سواد یا خراجی زمین کہا جاتا ہے، کے بارے میں فقہا کا فیصلہ سنیئے۔ اس وقت ہمارے سامنے علامہ خطیب بغدادی کی مشہور

کتاب تاریخ بغداد کی پہلی جلد ہے اور علامہ نے خاص اس مسئلہ پر کوئی چالیس صفحات پر مشتمل بحث فرمائی ہے۔ جس میں بغداد اور دوسری خراجی زمینوں میں مکانوں کی ملکیت اور ان کی خرید و فروخت کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بغداد شہر کی زمینوں کی فروخت کے بارے میں فقہاء کا اصولی حکم یہ بتایا گیا ہے۔

ومنع جماعۃٌ من العلماء من بیع ارض بغداد لکونها من ارض السواد وارض السواد عندهم موقوفۃٌ لا یصحُ بیعها۔ (تاریخ بغداد جلد اول صفحہ ۸)

علماء کی ایک جماعت نے بغداد کی زمین کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ وہ سواد کی زمین ہے (یعنی غیر عرب زمینیں جو مسلمانوں نے فتح کیں) کیونکہ ان کے نزدیک ایسی اراضی مسلمانوں کے لئے وقف ہے (یعنی اسلامی ریاست کی ملکیت ہے) اس لئے اس کی خرید و فروخت جائز نہیں۔

مکان کا ملبہ فروخت کرنیکی اجازت

ہاں اگر کوئی شخص نقل مکانی یا کسی دوسری وجہ سے اپنا مکان بیچنا چاہتا تو اسے صرف اوپر بنی ہوئی عمارت یا ملبہ فروخت کرنے کا حق ہوتا تھا۔ وہ زمین کی فروخت کا مجاز نہیں تھا۔ فقہاء کے الفاظ ہیں

بل رأوا ان تباع الانقاض دون الارض (تاریخ بغداد جلد ا صفحہ ۸)

ان فقہاء نے یہ رائے دی کہ زمین کا ملبہ بیچا جا سکتا ہے زمین نہیں بیچی جا سکتی۔

ملکیت زمین پر ملوکیت کی دست درازی

جیسا کہ ہم ابتداء میں واضح کر چکے ہیں مسئلہ ملکیت زمین کوئی نظری مسئلہ نہیں تھا بلکہ ایک عملی مسئلہ تھا۔ اس لئے ملوکیت اس کی ہیئت کو نہ بدل سکی۔ بنو امیہ کے دور حکومت میں جب حکومت کمزور ہوئی تو شاہی خاندان کے مختلف لوگوں نے خراجی زمینوں کو عشری زمینوں میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ ریاست کی ملکیت کو ذاتی ملکیت میں بدلنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ لیکن جب حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بارِ خلافت سنبھالا تو آپ نے اپنے تمام تصرفات ختم کر کے پھر زمین کو خراجی قرار دے کر ریاست کی ملکیت میں دے دیا۔ آپ کا یہ فیصلہ ملاحظہ ہو۔

ان بنی امیۃ کانوا قد توسعوا فی التصرف فی الاراضی الخراجیۃ بالبیع وغیر ذالک فتصیر عشریۃ۔ فلما جاء عمر بن عبد العزیز منع من ذالک لانّ ارض الخراج فیئٌ ای ملکٌ عامٌ للدولۃ۔ (الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ للریس مطبوعہ مصر صفحہ ۳۷۶)

بنو امیہ نے خرید و فروخت وغیرہ کے ذریعے خراجی زمینوں پر دست درازی شروع کر دی اور انہیں

عشری میں تبدیل کیا جانے لگا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو آپ نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ خراجی زمینیں تو مال فیٔ ہیں یعنی ریاست کی ملکیت۔

حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کے بعد پھر طوائف الملوکی کا زمانہ آگیا اور زمین کی ملکیت میں پہلے کی طرح تصرف ہونے لگا۔ یہاں تک کہ خلافت بنو امیہ کے ہاتھوں سے نکل کر عباسی خاندان میں پہنچ گئی۔ اس زمانے میں ریاست کی آمدنی کا زیادہ تر دارومدار اراضی پر ہی تھا اس لئے اس قسم کی دستبرد خود مستحکم ملوکیت کے مفاد کے بھی خلاف تھی۔ چنانچہ جونہی عباسی حکومت مستحکم ہوئی تو اس کے دوسرے خلیفہ ابوجعفر منصور نے ایک دفعہ پھر ایسے تمام معاملات منسوخ کر کے زمین بیت المال کی ملکیت میں دے دی۔

فامر کما ذکرنا بابطال ما احدث من امثال ھذہ التصرفات من عام مائۃ وان ترد الاراضی الی اراضی خراجیۃ کما کانت۔ وان لا یسمح منذ ذالک الوقت بتحویل الاراضی الخراج الی اراضی عشریۃ۔ (ایضاً ص ۲۷۲)

پس جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اس نے حکم دیا کہ سنہ ۱۰۰ھ کے بعد ایسے تمام تصرفات کو باطل قرار دیا جائے اور یہ کہ پہلے کی طرح ان زمینوں کی خراجی حیثیت بحال کی جائے۔ اس کے بعد کسی خراجی زمین کو عشری بنانے کی اجازت نہ دی گئی۔

اراضی ہند کی حیثیت

یہ تو تھی عراق و عرب کی اراضی کی شرعی حیثیت کہ وہ ریاست کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد یہاں کی اراضی کو بھی اراضی سواد ہی میں شمار کیا گیا یعنی وہ غیر عرب علاقے جو مسلمانوں نے فتح کئے۔ چنانچہ فقہاء نے ان زمینوں کے بارے میں بھی وہی فیصلہ دیا جو اراضی عراق وغیرہ کے بارے میں دیا گیا تھا۔

برصغیر ہند و پاک میں سب سے پہلے ۹۳ھ میں سندھ فتح ہوا۔ اس وقت سندھ بڑے وسیع علاقے کا نام تھا جو پنجاب گجرات اور بلوچستان کے بعض علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ تمام برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ ہمارے فقہاء عام طور پر مفتوحہ علاقوں کی اراضی کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہم سردست اس مسئلے کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے۔ ہمارے موضوع کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ سندھ کی زمینیں کونسی قسم کے تحت آتی ہیں۔ اس کی تفصیل مفتی محمد شفیع صاحب کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں۔

باقی تمام اراضی مفتوحہ میں تیسری قسم کا اختیار خلیفۃ السلطان نے نافذ کیا ہے یعنی مالکانِ سابق کو ان کی ملکیت اراضی پر بدستور قائم رکھ کر زمینوں پر خراج مقرر کر دیا گیا۔ مالکانِ سابق کے تمام مالکانہ تصرفات جائز و برقرار رکھے گئے۔ یہی وہ معاملہ ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق، شام اور مصر کی اراضی کے

ساتھ بمشورہ صحابہؓ اختیار فرمایا۔ اور یہی صورت فاتح سندھ حضرت محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے تمام ممالک سندھ میں اختیار فرمائی۔ تاریخ سندھ و ہند اس امر کی تصریحات سے لبریز ہے کہ مالکان سابق کو ان کی اراضی پر بدستور قائم رکھا گیا۔

(اسلام کا نظام اراضی۔ از مفتی محمد شفیع صاحب۔ مطبوعہ کراچی۔ صفحہ ۶۶)

اور اس کے قائم رہنے کی صورت وہی تھی جسے ہم فقہ کی مشہور کتاب شامی سے نقل کر آئے ہیں یعنی یہ اراضی کاشتکار کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ چلتی تھی۔ لیکن وہ نہ وراثت میں تقسیم ہوتی تھی اور نہ ہی اس کی خرید و فروخت کی اجازت تھی۔

اراضی ہند کی ملکیت میں تصرف

مغلیہ حکومت کی کمزوری کے بعد مفاد پرست لوگوں نے اراضی کی شرعی حیثیت بدلنے کی کوششیں شروع کر دیں اور اسے ریاست کی ملکیت سے نکال کر اپنی ذاتی ملکیت میں لانا شروع کر دیا۔ علمائے حق نے اس غیر اسلامی تصرف کو روکنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اس بارے میں شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہؒ دہلوی کا فتویٰ ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے اسلامی ریاست میں زمین کی ملکیت کا مسئلہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ ہم اسے پہلے انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں اور بعد میں اس کا ترجمہ ہدیہ قارئین کیا جائے گا۔ فرماتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ

حضرت جلال تھانیسری قدس اللہ سرہٗ العزیز رسالہ در احکام اراضی ہند قلمی فرمودہ اند۔ در آں رسالہ ایں مذہب را بشواہد و دلائل بسیار ابطال فرمودہ تحقیق فرمودہ اند کہ اراضی ہند بدستور اراضی سواد عراق موقوف بر ملک عامۃ المسلمین پے تخصیص است۔ یعنی در ملک بیت المال است و زمینداراں را بیش از قیم بودن و خلے نیست و قاضی محمد اعلیٰ تھانوی نیز در ایں باب رسالہ نوشتہ و ہمیں مسلک را ترجیح دادہ۔ مگر بنا بر آنچہ حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہٗ در رسالہ خود اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سواد عراق کہ در عہد حضرت فاروق مفتوح شدہ بود موقوف بر ملک بیت المال است۔ و زمینداراں را بیش از تولیت و دار و فکے تردد و فراہم کردن مزارعین و اعانت و زراعت و حفظ دخلے نیست۔

(فتاویٰ عزیزی مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی۔ جلد ۱ صفحہ ۴۳)

(ترجمہ) اور حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہٗ نے ایک رسالہ اراضی ہند کے احکام کے بارے میں لکھا اور اس رسالے میں انہوں نے اس مذہب کو کہ ہندوستان کی زمین زمینداروں کی ملکیت ہے، بہت سے دلائل و شواہد سے باطل قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی اراضی آج بھی بدستور سابق عراق کی اراضی کی طرح عامۃ المسلمین کے لئے وقف ہیں۔ یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں، کسی شخص و فرد کی ملکیت نہیں اور نہ ہی زمینداروں کی

ملکیت اور نہ زمینداروں کو چوہدری اور نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل ہے۔"

"اور قاضی محمد اعلیٰ تھانوی نے بھی اس بارے میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے اور انہوں نے اسمیں شیخ جلال ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔ شاید اس مسلک کی بنیاد پر کہ حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہٗ نے اپنے رسالہ میں اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ابتداءً فتح میں عراق کی طرح جو کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا، بیت المال کی ملکیت پر ہی قائم ہے۔ اور زمینداروں کو اس کے سوا کہ وہ متولی و داروغہ ہیں اور کاشتکاروں کو تلاش کر کے زمین دینے، اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غور و فکر میں رہنے کے علاوہ اور کوئی حق حاصل نہیں ہے اور نہ ان کی ملکیت کا کوئی دخل ہے۔"

انگریز اور نظامِ زمینداری

لیکن افسوس ہے کہ اتنے واضح شرعی احکامات کے باوجود مسلمانوں نے خراجی زمینوں کی شرعی حیثیت میں تصرف کرنا شروع کیا اور جس کا بالآخر سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں ہی کو اٹھانا پڑا۔ وہ اس طرح کہ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انہی متولیوں اور داروغوں کو موروثی زمیندار قرار دے کر نظامِ زمینداری کی بنیاد رکھ دی۔ امید تھی کہ بعد میں بھی علمائے حق اس ناجائز تصرف کیخلاف آواز اٹھاتے رہیں گے لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانا تو کجا، الٹا زمینداری نظام کے حق میں مستقل کتابیں تصنیف کی جانے لگیں۔ اس بارے میں مودودی صاحب کی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" خاصی شہرت کی مالک ہے۔

اراضی پاکستان کی شرعی حیثیت

چنانچہ انگریزوں کا کاشت کیا ہوا یہ زمینداری نظام کا پودا دن بدن پروان چڑھتا رہا اور اس پر پچھلی پوری ایک صدی گزر جانے کے باوجود کسی نے اس کی شرعی حیثیت کے متعلق کچھ نہ کہا اور نہ لکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خراجی اراضی کے عشری اراضی میں تبدیل ہو جانے سے "عشر" زیادہ تر انہی حضرات کی خدمت میں پیش کیا جانے لگا لیکن حق ہمیشہ بلند ہو کر رہتا ہے اس پر کتنے ہی پردے کیوں نہ ڈال دیئے جائیں اور ایک غیر متعلقہ مسئلہ کے ضمن میں مسئلہ ملکیت زمین بھی دوبارہ ابھر کر سامنے آگیا۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ہندو جو اراضی چھوڑ گئے تھے ان میں سے بعض کو مذہبی و دینی مقاصد کے لئے استعمال کر لیا گیا۔ بعض علماء نے اس پر شرعی شبہات کا اظہار کیا۔ چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحب نے اراضی کی ملکیت پر ایک مستقل کتاب "اسلام کا نظامِ اراضی" تصنیف فرمائی جس میں ایسی اراضی کی شرعی حیثیت پر انہوں نے لمبی چوڑی بحث فرمائی جو بدقسمتی سے بعض مقامات پر الجھ کر رہ گئی ہے۔ تاہم اس ساری بحث کا جو خلاصہ انہوں نے خود نکالا ہے وہ انہی کی زبانی سنیئے۔

"سابقہ تفصیل میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی اراضی شرعاً اراضی بیت المال کے حکم میں ہیں جس کا ضابطہ شرعی یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان ان کی متولی ہے' وہ ان زمینوں کو باشندگانِ ملک میں حسب صوابدید تقسیم بھی کر سکتی ہے اور ان کی ضروریات کے لئے ان میں مساجد، مدارس' رفاہی ادارے خود بھی بنا سکتی ہے۔ دوسرے مسلمانوں کو بنانے کے لئے بھی دے سکتی ہے۔

(اسلام کا نظامِ اراضی مطبوعہ کراچی ۔ صفحہ ۱۹۴)

برصغیر میں انگریزوں کے دور کو صلیبی لڑائیوں کے دور پر قیاس کیا گیا ہے کہ جو نہی ان لوگوں کو ارضِ مقدس سے نکال دیا گیا تو ان علاقوں کی اراضی کی وہی پہلی صورت بحال ہو گئی تھی یعنی وہ بیت المال کی قرار دے دی گئی تھیں مفتی صاحب نے لمبی چوڑی بحث کے بعد ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی اراضی کا مساجد اور دینی مدارس کے لئے استعمال کا جواز نکالا تو ان کی بحث سے انگریزی نظام کے پیدا کردہ زمینداری سسٹم کی بنیاد بھی ہل گئی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس بارے میں کوئی واضح اور دو ٹوک فیصلہ دینے کی بجائے اسے الجھا دیا گیا یعنی جس کی مرضی آئے اراضی پاکستان کو خراجی قرار دے دے اور جس کا جی چاہے اسے عشری سمجھ لے۔ دیکھئے مفتی صاحب کس طرح ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں۔

اراضی ہند خراجی ہیں یا عُشری

مفتی صاحب برصغیر ہند و پاک کی اراضی کی شرعی حیثیت کے متعلق برصغیر ہی کے ایک بہت بڑے عالم دین' مخدوم محمد عارف صاحب کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

الظاھر انّ ارض السند والھند خراجیۃ۔ وخراجھا الخمس کما حققہ' الشیخ المحقق الدھری فی رسالتہ المسماۃ برفع العزیۃ ونقل فیھا عن جامع الفتاویٰ الناصری انّ ارضنا عشریۃ ۔ ولکن ضعف ھذا النقل ۔ (اسلام کا نظامِ اراضی ۔ صفحہ ۱۲۵-۱۲۶)

مخدوم صاحب کی یہ عبارت بڑی سادہ اور واضح ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں بنتا ہے۔

"ظاہر یہ ہے کہ ہند و سندھ کی زمینیں خراجی ہیں (یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں) اور ان کا خراج پانچواں حصہ پیداوار کا ہے۔ جیسا کہ محقق دہری (الشیخ ابو الحسن سندھی) نے اپنے رسالے "رفع العزیۃ" میں ذکر کیا ہے۔ اس رسالے میں انہوں نے جامع الفتاویٰ ناصری سے یہ قول نقل کیا کہ ہماری زمینیں عشری ہیں۔ لیکن اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔

اصل اور ترجمے کے آخری جملے کو ہم نے اس لئے خط کشیدہ کیا ہے کہ اس سے مفتی صاحب کے ترجمے کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ مثلاً مخدوم عارف صاحب کے قول سے یہ واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ برصغیر کی زمینیں خراجی لہٰذا بیت المال کی ملکیت ہیں اور اسی حکم کا اطلاق پاکستان کی تمام اراضی پر ہو گا کہ وہ ریاست کی ملکیت قرار پاتی ہیں۔ لیکن مفتی صاحب

اس عبارت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے برصغیر کی زمینوں کو خراجی کی بجائے عشری ہونا ثابت ہو جائے۔ ان کا بھی وہ تصرف ہے جسے ہم نے ان کی "ہاتھ کی صفائی" سے تعبیر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اس عبارت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

"ظاہر یہ ہے کہ ہند و سندھ کی زمینیں خراجی ہیں اور ان کا خراج پانچواں حصہ پیداوار کا ہے۔ جیسا کہ محقق دہری (شیخ ابوالحسن سندھی) نے اپنے رسالہ رفع العزیۃ میں ذکر کیا ہے اور اسی رسالہ میں جامع الفتاویٰ ناصری کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ ہماری زمینیں (یعنی سندھ کی) عشری ہیں۔"

دیکھئے کس طرح خط کشیدہ جملے کا ترجمہ حذف کر کے خراجی زمین کو عشری بنا دیا گیا ہے۔ یعنی کہاں وہ ریاست کی ملکیت قرار پاتی ہیں اور کہاں ان کی ذاتی ملکیت کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ان کا کوئی واضح فیصلہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں جس طرح مختلف تفصیلات پیش کر کے خراجی اور عشری کی بحث کو الجھا دیا ہے، اس سے دونوں مفہوم نکالے جا سکتے ہیں۔ یعنی جس کا جی چاہے انہیں خراجی سمجھ لے اور جس کا جی چاہے عشری۔ اس کے باوجود مفتی صاحب کی یہ کتاب اس اعتبار سے غنیمت ہے کہ پچھلی پوری صدی میں یہ شاید پہلی کتاب ہے جس نے دانستہ یا نادانستہ طور پر زمینداری نظام کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ امید ہے موجودہ حالات کی روشنی میں کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں خراجی اور عشری والا الجھاؤ بھی ختم ہو جائے گا۔

نگاہِ بازگشت

اب تک جو تفصیلات پیش کی جا چکی ہیں، ان پر نگاہِ بازگشت ڈالتے جائیے۔

(۱) اسلامی ریاست کو عام طور پر اراضی کو دو طرح پر تقسیم کیا گیا۔ ایک عشری اور دوسری خراجی۔ عشری سے عام طور پر اہل عرب کی زمینیں مراد لی گئیں اور خراجی سے مراد سواد یعنی عرب کے باہر کا مفتوحہ علاقہ۔

(۲) خراجی زمینوں کو جہاں ریاست کی ملکیت سمجھا جاتا تھا وہاں عشری کے متعلق یہ تصور قائم کیا گیا کہ یہ ذاتی ملکیت ہیں۔ لیکن جیسا کہ تفصیلات پیش کی جا چکی ہیں، ملکیت کے لحاظ سے خراجی اور عشری زمینوں میں بہت معمولی فرق تھا۔ یعنی دونوں قسم کی زمینوں کی خرید و فروخت ناجائز تھی۔

(۳) خراجی زمین پر کام کرنے والے کاشتکار کو من وجہ حقوق ملکیت حاصل تھے جس کی وجہ سے وہ زمین اس کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتی۔ البتہ وہ وراثت میں تقسیم نہ ہوتی اور اگر وہ قابض کاشتکار نقل مکانی کرنا چاہتا یا اس کی ترنیہ کام کرنے والی اولاد نہ ہوتی تو یہ زمین دوبارہ اسلامی ریاست کی ملکیت میں چلی جاتی۔

(۴) طوائف الملوکی کے زمانے میں شاہی خاندان کے افراد نے خراجی زمینوں کو عشری بنانا چاہا۔ لیکن جونہی مضبوط حکومت قائم ہوتی، ایسے تمام معاملات منسوخ کر دیئے جاتے۔ اس لئے صدر اول سے لے کر عثمانی حکومت کے خاتمے یعنی ۱۹۲۴ء تک مملکت کی اراضی ریاست کی ملکیت سمجھی جاتی رہیں۔

(۵) برصغیر ہند و پاک کی زمینیں بھی خراجی قرار دی گئی تھیں۔ یعنی اسلامی ریاست کی ملکیت۔ اور جب مغلیہ حکومت کے زوال پر بااثر افراد نے انہیں عشری میں تبدیل کرنا شروع کیا تو علمائے حق نے ڈٹ کر مخالفت کی۔ اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ دہلوی کا مشہور فتویٰ ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۶) لیکن علماء کے ان فتاوے اور مخالفت کے باوجود انگریزی حکومت نے زمینداری نظام قائم کر کے ان لوگوں کو جن کی حیثیت متولیوں یا داروغوں کی تھی، موروثی زمیندار قرار دے دیا۔

(۷) اس کے بعد نامعلوم وجوہات کی بنا پر زمینداری نظام کی مخالفت ترک کر دی گئی۔ اب زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے ہمارے علماء کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ان اراضی کے بارے میں شرعی احکام کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیں۔ چنانچہ پوری ایک صدی کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب کی کتاب "اسلام کا نظامِ اراضی" میں کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

حرفِ آخر

اسلامی ریاست میں اراضی کی ملکیت کے بارے میں جو تفصیلات اوپر پیش کی گئی ہیں۔ وہ ہماری مستند ترین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ وہ دینی کتابیں ہیں جنہیں ہمارے ہر طبقے کے علماء مستند سمجھتے ہیں۔ بلکہ اب خود بھی انہیں کسی نہ کسی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے انتخابات میں جو مختلف علماء زمین کی ملکیت کی حد بندی کے بارے میں نعرے لگائے تھے ان کا شریعتِ اسلامیہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اسلامی ریاست میں تمام کی تمام اراضی چاہے وہ زرعی ہو یا رہائشی، ریاست کی ملکیت ہوتی ہیں۔ اور کسی فرد کو ان کی خرید و فروخت کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی کوئی ضرورت سے زیادہ اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ کاش زمین کی شرعی حیثیت کے بارے میں یہ احکام قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی سامنے لے آئے جاتے تو آج ہمارے ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ ہمارے ملک میں پچاس فیصد جرائم اور اس سے زیادہ مقدمات بالواسطہ یا بلاواسطہ زمین کی ملکیت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ زمین کو اگر ریاست کی ملکیت قرار دے دیا جاتا تو نہ صرف ان جرائم اور مقدمات کا وجود نہ ہوتا بلکہ دوسرے جرائم بھی خاطر خواہ حد تک کم ہو جاتے۔ مکانات کی قلت کا مسئلہ خود بخود ختم ہو جاتا۔ کیونکہ جب رہائشی زمین کی خرید و فروخت کی اجازت ہی نہ ہوتی تو ان قطعات کی قیمتیں کبھی آسمان سے باتیں نہ کرتیں اور ہر ضرورت مند اپنی ضرورت کے مطابق اپنی چھت بنا سکتا۔ مکانات کا مسئلہ بڑا تفصیلات طلب ہے، انشاء اللہ ہم آئندہ اشاعت میں ملکیتِ اراضی کے اس تصور کی روشنی میں اس پر ایک مفصل مقالہ قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔

ملکیت کے اس اسلامی تصور کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ زمین پر کام کرنے والا کاشتکار بلاشرکتِ غیرے پیداوار کا مالک خود ہوتا اور اس طرح کروڑوں کاشتکاروں کے خون پسینہ پر پلنے والے چند

لاکھ غیر کاشتکار مفت خور زمینداروں کا وجود تک نہ ہوتا۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جو ہمارے ملک کی سیاست پر چھائے رہے ہیں اور ملک کو تباہی کے گڑھے پر لاکھڑا کیا ہے۔ آخر میں اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ ہمارے ملک میں وہ دن جلد لائے جب زمین کی ملکیت کے بارے میں ان احکام پر عملدرآمد شروع ہوجائے جیسا کہ تمام اسلامی حکومتوں کے دوران ہوتا رہا ہے۔

معراجِ انسانیت

پرویز

سیرتِ صاحبِ قرآن، خود قرآن کے آئینے میں
حسنِ سیرت کی رعنائیاں — خالقِ حسن کی نگاہ میں

- سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اس کی تشریح احادیث صحیحہ کی روشنی میں۔
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رو سے۔
- غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلل اور مسکت جواب۔
- دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کا خراجِ تحسین۔

بارگاہِ رسالتمآب میں

• ایک انقلاب انگیز تصنیف • ایک عہد آفریں کوشش • عشق و خرد کا حسین امتزاج • بڑا سائز • ضخامت تقریباً پانچسو صفحات • کاغذ نہایت اعلیٰ • جلد مضبوط • گرد پوش جاذبِ نگاہ۔

قیمت : بیس ۲۰/ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ☼ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

حقائق و عبر

۱۔ یہ کس قسم کی مخلوق ہے؟

بھلے مانسوں کے معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص کا کوئی جھوٹ ثابت اور ظاہر ہو جائے تو وہ لوگوں سے منہ چھپاتے چھپاتے پھرے گا۔ فرطِ ندامت سے اس کا بُرا حال ہوگا۔ دوبارہ جھوٹ بولنا تو ایک طرف، وہ محفل میں سچی بات کہنے سے بھی جھجکیگا کہ مبادا لوگ اسے بھی جھوٹ ہی سمجھ لیں۔ اسے اپنا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کرنے کے لئے، اس جھوٹ کا بہت بڑا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔

لیکن ہمارے ہاں ایک مخلوق بستی ہے جس کی کیفیت عجیب و غریب ہے۔ اس مخلوق کا تعلق ہماری صحافت سے ہے۔ حالت یہ ہے کہ ایک اخبار میں ایک دن کوئی خبر شائع ہوتی ہے اور جس کے متعلق وہ خبر ہوتی ہے وہ دوسری صبح روتا، چیختا، چِلّاتا دُہائی دیتا نظر آتا ہے کہ میں نے ایسا قطعاً نہیں کہا۔ یہ خبر میری طرف غلط منسوب کر دی گئی ہے۔

اس پر نہ اس اخبار کی طرف سے کوئی معذرت شائع ہوتی ہے، نہ کسی قسم کا اظہارِ ندامت۔ بلکہ دوسرے دن پھر اسی قسم کی ایک اور جھوٹی خبر بڑے دھڑلے سے شائع ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ مسلسل اور متواتر جاری رہتا ہے۔ اس افترا سازی کا کاروبار کرنے والے نامہ نگار حضرات یا ایڈیٹر، وہ بڑے دھڑلے سے مجلسوں میں آتے ہیں، بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے ہیں، نہ ان کے چہرے پر کسی قسم کی ندامت کے آثار ہوتے ہیں نہ آنکھوں میں شرمساری کی ذرا سی بھی جھلک، اور جس بیچارے کے متعلق اس قسم کی خبریں شائع کی گئی تھیں، وہ ایک کونے میں مجوب و مرعوب دبکے بیٹھا رہتا ہے کہ اگر میں نے کچھ کہا تو معلوم یہ کل کو اور کیا کچھ نہ شائع کر دیں۔ ان کے ہاتھوں نہ کسی کی بہو بیٹی کی عزت محفوظ ہے، نہ بہن اور بیوی کی آبرو مصئون۔ جس کے خلاف جی چاہا ایک افسانہ وضع کر دیا اور پھر اسے نہایت رنگین سرخیوں کے ساتھ جلی حرف میں شائع کر دیا۔ اس کے تدارک کے لئے، کہنے کو، ازالۂ حیثیت عرفی کا ایک قانون ملک میں رائج ہے، لیکن اس قانون کی رُو سے انصاف حاصل کرنے کے لئے جن زہرہ گداز مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے، اس کے مقابلہ میں ایک شریف آدمی، اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ خاموشی سے اس ذلت کو برداشت کر لیا جائے۔ اس سے اس مخلوق کے حوصلے اور بھی بڑھ جاتے ہیں ــــــ یہ ہے ہماری صحافت!

۲- ٹیلی ویژن کے "اسلامی پروگرام"

مملکتِ پاکستان کے سرِ عنوان جو "اسلامی" جھونکا (۲۸۶) لکھ دیا گیا ہے تو اس سے عجیب عجیب قسم کی پریشانیاں اور مصیبتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثلاً اپنے ہاں کے ٹیلی ویژن والوں کو لیجئے۔ ان بیچاروں کو اپنے پروگرام میں "اسلامیات" کو مجبوراً شامل کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں "مختلف" "اسلامی" موضوعات پر تقریریں کرانی پڑتی ہیں، مذاکروں کا انتظام کرنا پڑتا ہے، "اسلامی تقاریب" منانی پڑتی ہیں۔ انہیں اس سے کوئی دلی شغف یا قلبی لگاؤ نہیں ہوتا۔ فریضۂ ملازمت کا گلے پڑا ڈھول ہوتا ہے جسے طوعاً و کرہاً بجانا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ان محافل میں شرکاء کے پیشِ نظر بھی کوئی دینی یا ملّی مقصد نہیں ہوتا ... یا تو معاوضہ کا خیال ہوتا ہے اور یا نمود کا جذبہ۔ دیگر پروگراموں میں حصہ لینے کے لئے کسی نہ کسی خصوصیت یا (QUALIFICATION) کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے لیکن اسلامی پروگراموں کے لئے اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے لئے نہ انتخاب میں اہلیت کی شرط یا اسے جانچنے کا کوئی معیار ہوتا ہے، نہ مدعوین میں سے کوئی یہ کہہ کر معذرت پیش کرتا ہے کہ میں اس کا اہل نہیں۔ ہر شخص اس میدان کا شہسوار ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ اس کا نام مسلمانوں کا سا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان پروگراموں میں اسلام کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے اس پر عقل ہنستی اور دین شرماتا ہے۔ اس سے غیر مسلم کیا تاثر لیتے ہیں، اسے تو چھوڑیئے، اس کا سب سے بڑا اور ناقابلِ تلافی نقصان ایک اور ہے۔ ٹیلی ویژن، بچوں اور نوجوانوں کے قلب و دماغ کو متاثر کرنے اور ان پر گہرے نقوش مرتسم کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ وہ ان "اسلامی" پروگراموں کو بھی بڑے جذب و انہماک سے سنتے اور دیکھتے ہیں، اور اس سے اسلام کے متعلق جو تصور ان کے ذہن میں منقوش ہوتا ہے وہ انہیں اسلام کی طرف سے برگشتہ بلکہ متنفر کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ان پروگراموں کو دیکھنے کے بعد بچے جس قسم کے سوالات کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے معصوم دلوں کو کس کشمکش میں [illegible] کر دیا جاتا ہے اور نوجوان طبقہ جس طرح ان کا مذاق اڑاتا ہے وہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس سے فضا میں کس قسم کا زہر پھیل رہا ہے۔

ہم ٹیلیویژن سے متعلق اربابِ نظم و نسق کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ ان پروگراموں میں اصلاح کرنا تو ان کے بس کی بات نہیں، اس لئے وہ اگر انہیں بند کر دیں تو یہ (مظلوم) اسلام پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

(اعلان)

جہانِ نو

وہ کتابچہ جس میں طلوعِ اسلام کے شائع کردہ انقلاب آفریں لٹریچر کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے

ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمایئے

اس قسم کا لٹریچر آپ کو اور کہیں نہیں مل سکیگا۔

(ناظم)

محمد اسلام

تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف

(بانیٔ تحریک کے الفاظ میں)

تقسیم سے قبل گو طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید دورِ حاضرہ کی اصطلاح یا مفہوم میں ایک "سیاسی مقصد" کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ طلوعِ اسلام کا مؤقف قرآنی تصور کی مطابق یہ تھا کہ اسلام ایک دین (یعنی نظامِ مملکت) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اقدار کی حکمرانی ہو۔ اس طرح یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کیساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزیں کرتا چلا گیا کہ اسلام کا مقصود کیا ہے اور دین کا مطمحِ نگاہ کیا، وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور وہ ضابطہ یا نظام کس طرح دیگر نظامہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے۔ وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کر سکتا! اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔

نظامِ خداوندی کو ایک آزاد خطۂ زمین پر مشہود کرنے کی یہی وہ حسین آرزو اور مقدس تمنا تھی جس کو لیکر حصولِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام پھر جادہ پیما ہوا۔ اس کے نزدیک حصولِ مملکت کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دین کے جن امور کو وہ اب تک اصولی طور پر پیش کرتا چلا آیا ہے ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈال کر اسکے نمایاں خط و خال امت کو دکھائے اور قرآن ہی کی روشنی میں [illegible] اس کے قیام کی موجودہ عملی صورت کا تعین کرے۔ طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر دوسرا کام یہ تھا کہ وہ تمام سلیم قلب، سعید روحیں جو قرآن کریم کے اس حیات آفریں پیغام سے ہم نوا ہیں لیکن کسی مرکز کے نہ ہونے کے سبب تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے بے خبر اطراف و جوانبِ ملک میں الگ الگ پڑی ہیں اور با وجود ہزار بار سوچنے کے آگے قدم نہیں اٹھا سکتیں کہ وہ اس میدان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں! انہیں یک دلی اور ہم مشربی کے رشتۂ محکم میں منسلک کر کے ایک ذہنی مرکز پہ جمع کر لیا جائے اور اس طرح ان افراد کے اجتماع سے وہ قافلہ مرتب ہو جائے جس کا ہر قدم صحیح منزل کی طرف اٹھے۔

جہاں تک قرآنی نظامِ زندگی کے خط و خال کا تعلق ہے اس کی تفصیل طویل ہے اور اس مختصر وقت میں اسے پیش کرنا دشوار۔ محترم پرویز صاحب نے اس کو وضاحت کے ساتھ رسالہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات اور بیسیوں کتابوں کی شکل میں منتقش کر کے انہیں ملک میں عام کر دیا ہے اور جن کا چرچا آج اطرافِ عالم میں سنتے ہیں لیکن مختصر طور پر پرویز صاحب نے انہیں طلوع اسلام کے مقصد و مسلک میں پیش کیا ہے جو یہ ہے:۔

(۱) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔ خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(۲) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(۳) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(۴) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبارؓ) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(۵) رسول اللہؐ کے بعد دین کا یہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا جو ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا جن میں کسی رد و بدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا، جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہٖ باقی رکھا۔

(۶) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(۷) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا امت کے مختلف فرقے، مختلف جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ہم میں جو عقاید و رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(۸) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آ سکتی ہے نہ رسول اللہ کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(۹) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ تک مختلف علوم و فنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ سب انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے۔

(۱۰) نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرفِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کی مظہر تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری کتبِ روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضورؐ کیطرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے صحن چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(۱۱) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ نہ ہی ہم نے کوئی نئی قسم کی نماز ایجاد کی ہے۔ نہ روزوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ قرود ہی کے ہیں۔ احکامِ اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(۱۳) قرآنی نظام میں تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائلِ پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم یا سوشلزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آیند ہو سکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ تھے دینِ خداوندی کے وہ خط و خال جنہیں طلوعِ اسلام .... نہایت مستقل مزاجی سے عوام کو دکھاتا رہا۔ اور یہی تجلیات کی وہ فشاں جس سے ریت میں ملے ہوئے فولادی ذرات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہو گئے اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس حیات آفریں پکار پر کھنچے چلے آئے۔

انہی افراد پر مشتمل تنظیمی ہئیت کا نام "بزمِ طلوعِ اسلام" ہے۔ ان بزموں کا مقصد اور مشن طلوعِ اسلام کی

طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

قرآنی پیغام کے عام کرنے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی کہ جب کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس موڈ میں ہی نہیں ہوتا کہ پیش آمدہ مسائل پر عقل و بصیرت کی رُو سے غور کرے اور دلائل و براہین کے مطابق کسی فیصلے پر پہنچے۔ افراد کے مجموعے ہی کا نام قوم ہوتا ہے اور جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جا رہی ہے اور بُری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے۔ یوں تو مغرب کی خدا فراموش سیاست کی بدولت انتخابات کی وبا ہر جگہ آندھی بن کر اٹھتی اور جھکڑ بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بدقسمتی سے اس نے اور ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں ایک طبقہ انسان کی طبیعی ضروریاتِ زندگی کے حصول کو اپنا مطمحِ نظر بنائے ہوئے ہے اور صرف اسی میں انسانیت کے فلاح و بہبود کا راز بتاتا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ اپنی ہر چیز کو داؤں پر لگائے بیٹھا ہے۔ دوسری طرف نظریۂ پاکستان کے مخالفین عوام کے ان جذبات کو مشتعل کرنے میں پوری شدت سے سرگرمِ عمل ہیں جن کا تعلق قلبِ انسان کے نہایت نرم و نازک گوشوں سے ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام دینِ خداوندی کے فروغ اور نظامِ ربوبیت کے قیام و عمل کی پیامبر ہے۔ ان حالات میں ایک طرف مذہب پرست طبقہ ہم سے متقاضی ہے کہ "دین خطرہ میں ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں اس لئے آپ ہمارے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کیجئے۔ دوسری طرف سرمایہ داری کے ظلم و استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی خون آشامیوں، عیاریوں اور مکاریوں کا شکار طبقہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم نظامِ ربوبیت کے پیامبر ہو اس لئے سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو دفن کرنے میں ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ تیسری طرف تحریک میں شامل وہ نئے نوجوان ہیں جن کی بے تابیٔ تمنا دبی زبان سے یہ شکوہ کرتی ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ہماری موجودہ رفتار نہایت سست ہے۔ اس کے لئے ہمیں باہر نکلنا چاہیئے۔ سوشل ورک کر کے ہمیں عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنی چاہئیں اور یوں عوام کی طاقت حاصل کر کے غیر قرآنی نظامِ کہن کی جگہ دینِ خداوندی کا نفاذ کرنا چاہیئے۔

اندریں حالات میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد، نصب العین اور اس کے حصول کے لئے طریقِ کار کو مختصر طور پر خود بانیٔ تحریک کے الفاظ میں پیش کر دوں۔

---

[1] یہ مقالہ سابقہ انتخابات سے پہلے کا لکھا ہوا ہے (طلوعِ اسلام)

دستور اساسی و اصولی ہدایات برائے بزم ہائے طلوع اسلام کی پہلی شق یہ ہے :- "بزم طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ، یہ ایک اجتماعی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں، انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہ میں قائم ہوا تھا۔"

چنانچہ طلوع اسلام کی پہلی کنونشن منعقدہ ۱۹۵۶ء میں محترم پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا:

"اس کے بعد میں اس کے دوسرے گوشے کی طرف آتا ہوں جو اس پہلے گوشے سے بھی زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ لطیف اتنا کہ بعض اوقات اسے صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب بغیر گروہ بندی اور پارٹی بازی کے برپا کیا جائے۔ چونکہ دور حاضرہ میں معمول یہ ہے کہ کوئی تحریک بغیر پارٹی بازی کے وجود میں نہیں آتی اس لئے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ پارٹی بازی کے بغیر بھی کوئی تحریک چل سکتی ہے۔ لیکن برادران! قرآن کریم سے جو کچھ تھوڑی بہت بصیرت میں نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملت کے اندر تعمیری انقلاب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی پارٹی بنائے بغیر ان میں فکری تبدیلی پیدا کرتے جائیں ..... قرآن کریم غیر مسلموں کے مقابلہ میں مومنین کو الگ جماعت، ایک جداگانہ امت قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امت کے اندر فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے، بعض احباب کہتے ہیں کہ قرآن مذہبی فرقہ کو تو شرک قرار دیتا ہے، سیاسی پارٹی کو شرک نہیں ٹھہراتا، ذرا سوچئے کہ جس اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہی نہیں اس میں مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مذہبی فرقہ ہو یا سیاسی پارٹی دونوں تفریق فی الدین ہیں۔ پھر کہا یہ جاتا ہے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے لئے اجتماعی کام کی ضرورت ہے، انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر پارٹی بنانا منع ہے تو یہ اجتماعی کام کس طرح سے ہو سکیگا۔ یہ اجتماعی کام منظم کوشش (ORGANISED EFFORT) سے ہو سکے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ پارٹی بازی اور منظم کوشش میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے تحزب (پارٹی بازی) کی تفصیلات کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جہاں کہا ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲) پارٹی کی عمارت تعصب کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور دوسروں سے نفرت کے جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے ممبر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی سعادتیں اور حسنات ان کی پارٹی میں جمع ہیں اور پارٹی سے باہر جتنے لوگ ہیں ان میں کوئی خوبی اور نیکی نہیں۔ اس سے ان کے اندر نخوت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو سخت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی ذلیل اور حقیر لوگوں میں سے جب کوئی ان کی

پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل بن جاتا ہے۔ پھر اس میں دنیا بھر کی خوبیاں آ جاتی ہیں۔ اگر وہ پارٹی کے ساتھ وفاشعار (LOYAL) رہتا ہے تو اس کا ہر عیب ہنر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اس کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے عیب اس کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جی بھر کر بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ پارٹیوں کے ساتھ متمسک رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کی تقویت ہر رکن کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا عین جہاد سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، وہ اسے کبھی نہیں سنتے اور اگر کبھی مجبوراً سننا پڑے تو اس کا تمسخر اڑاتے اور استہزار کی ہنسی ہنستے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا محبوب ترین مشغلہ دوسروں کی تذلیل و تحقیر ہوتا ہے، جس میں وہ بڑی لذت لیتے ہیں ..... یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک پارٹی ترتیب پاتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے منظم کوشش کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے قرآنی نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور جن کی آرزو یہ ہے کہ یہ نظام پھر سے ملت میں متشکل ہو جائے، وہ سب سے پہلے اس کی بنیادی خصوصیات خود اپنے اندر پیدا کریں اور پھر اس نظام کے تصور کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوں اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہوتی جائے۔ اس نظام کے متشکل کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں اور دوسروں کی نشوونما میں اپنی ذات کی بالیدگی اور ارتقار کا راز سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جو افراد اس مقصد کے حصول کے لئے منظم کوشش کرنے کے لئے اٹھیں، ان میں پارٹی بازی کی لعنتوں میں سے کسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہوگا۔ وہ دوسروں سے نفرت نہیں ہمدردی کریں گے۔ وہ ان کی بہبود کا سامان مہیا کرتے پھریں گے۔ وہ اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنے کام کی ابتدا بے شک کسی ایک مقام سے کریں گے لیکن پوری نوعِ انسانی ان کی برادری اور ساری دنیا ان کا گھر ہوگی۔ ان کی مساعی، خدا کی صفتِ رب العالمینی کی مظہر ہوں گی۔ اس میں ان کے ذہن زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانیاں ہوں گی اور دوسروں کے لئے بیش از بیش نفع بخشیاں اور راحت سامانیاں۔"

ایک دوسرے مقام پر پرویز صاحب نے فرمایا۔

"قرآن کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں، اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا، اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔"

ایک اور مقام پر موصوف نے کہا:-

"حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رُو سے انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رُو سے احترامِ انسانیت، انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم واستبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ یہ تبدیلی یقین (CONVICTION) سے آتی ہے۔ اور (CONVICTION) کی بنیاد دلائل و براہین کی رُو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔"

"دنیا میں ساری قوتوں کا راز، ایمان میں مضمر ہے۔ جس قدر آپ کا یقین محکم ہے اسی قدر نا قابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں۔ شکست و کامرانی کا بنیادی مدار ساز و سامان پر نہیں، یقین اور عدمِ یقین پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہو گا وہی دنیا میں کامیاب و شادکام ہوں گے۔ یہی شکست و فتح کا اٹل پیمانہ ہے۔ اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔ جب یقین ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے اور ایمان ہو اللہ واحد القہار پر تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلا سکتی۔"

"(نظامِ خداوندی) کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے۔ شعور کی یہ بیداری اور فکر و نظر کی یہ تبدیلی اس نظام کے تصور کے عام کرنے میں اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگہِ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔ اسی کا نام تعلیمِ کتاب و حکمت ہے۔ نبی اکرمؐ نے اسی نقطہ سے آغازِ کار کیا تھا۔ ... اس تصور کو عام کرنے سے ایسے سعادت مند افراد منتخب کر الگ ہو جاتے ہیں جن کی نگاہوں میں کشادگی اور قلب میں وسعت ہوتی ہے۔ اسی کا نام نفس کی بالیدگی ہے اور تعلیم و حکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا تعلق ہے۔"

تعلیم و حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے پرویز صاحب نے لکھا:

تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہے اور تزکیہ کا تعلق قلبِ انسانی سے۔ کسی حقیقت کو اس انداز سے واضح کر دینا کہ وہ دوسرے کی سمجھ میں آجائے تعلیم ہے۔ تعلیم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہو سکتی ہے قلبی ایقان نہیں۔ دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے قلبی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جو درحقیقت اعمالِ انسانی کا سرچشمہ ہے۔ جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب و تطہیرِ فکر پر نہیں وہ نظام کبھی نشو و ارتقاءِ انسانیت کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہو گا۔ بہترین دساتیر و قوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کر سکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور ان پر عمل کرنے والی قوم کے قلب و نگاہ کی اصلاح نہ ہو چکی ہو۔ عمل کا محرک جذبہ، قوتِ ارادی ہے اور قوتِ ارادی کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں۔ اس لئے تنہا علم عمل کا محرک نہیں ہو سکتا۔ قرآن اس قسم کی سوسائٹی تشکیل کرتا ہے جو اطاعتِ احکام میں اپنی ذات کی تسکین محسوس کرے۔ قلب

کی اس کیفیت کا نام تزکیہ ہے۔ جب قرآن قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ اور داخلی دنیا کی اس تبدیلی سے خارجی دنیا میں انقلاب عظیم آجاتا ہے۔ قرآن یہی انقلاب پیدا کرتا ہے۔"

(موصوف نے کہا) "قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کے محرک ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ، عقل اور عشق، جنون اور خرد، ذکر اور فکر، خبر اور نظر، دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے اور جو چیزیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں، وہ بھی درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہیں۔ "جنون اور خرد" جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کرکے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنا دینا قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے — اس قسم کا عقل اور جنون کا امتزاج جس میں نہ تو جنون مذہبی دیوانگی سکھائے اور نہ ہی عقل اس جنون کی چنگاری کو اپنی خاکستر کے نیچے دبا کر بجھا دے، قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ہیں وہ ارباب "خرد و جنون" جنہیں وہ اُولُوا الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (۳/۱۹۱) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ ارباب عقل و بصیرت جو زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے میں وحی کی راہ نمائی کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں اور کائنات کی گہرائیوں اور بلندیوں پر بھی غور و فکر کرتے ہیں، یہی ہیں وہ مکمل عدل کا "خواب" دیکھنے والے جو اس "خواب" کو ایک زندہ حقیقت بنا کر رکھ دینے کے اہل ہوں۔"

طلوع اسلام کی دوسری سالانہ کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا:-

"جو جماعت قرآنی نظام ربوبیت کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھتی اور اپنے اللہ سے بیع و شری کا معاملہ کرتی ہے اس کے نفع اور نقصان کے ماپنے کے پیمانے اور انداز دوسری جماعتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام جماعتوں کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنے ممبر بھرتی کئے، کس قدر سرمایہ فراہم کیا، کتنے جلسے کئے، کتنے جلوس نکالے، مخالفین کو دبانے کے لئے کون کون سے حربے استعمال کئے اور اس طرح انتخابات میں کتنی نشستیں حاصل کیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ ان کی آرزوں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں، وہ اپنی ذات، اپنے اہل و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانین خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو، قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔"

طلوعِ اسلام کی ساتویں کنونشن میں موصوف نے کہا :-

"انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے، قدیم تصوراتِ حیات اور نظام ہائے زندگی کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے، ملوکیت، سرمایہ داری، مذہب سب ایک ایک کر کے اٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں . . . . اس وقت لاؔ کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر الّا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد ان کے مقام سے ہٹانے، یا الّا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے بڑی جھلس رہی ہے۔"

طلوعِ اسلام کی نویں کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا :-

"یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس سال سے مسلسل پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا، مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔ جو شخص لوگوں کے سامنے ان کے مروجہ عقائد اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے، اسے ان کا مسلمہ لیڈر، راہ نمائے شریعت یا مرشدِ طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن جو شخص ان کے غلط عقائد اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے، انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔ میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزر رہی تھی اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا، اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اس کا قائد بن جانا، میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق بخشی کہ میں ان تمام نگاہ فریب جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر، قرآن کی آواز پر لبیک کہوں اور اس طرح دنیا جہاں کی مخالفت مول لے لوں۔ میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جانتے بوجھتے، سوچتے سمجھتے کیا اور مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پُرخار وادیوں کو اختیار کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی مشقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخِ اقوام کے مطالعے سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے[1]۔ مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے جوں جوں

---

[1] جو نظامِ حیات خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتا ہے اسے دین کہا جاتا ہے۔ جب اس میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو جاتی ہے تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔ ہمارا مروجہ اسلام بھی مذہب بن چکا ہے۔

علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے مذہب چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بالآخر یہ حقیقت سامنے آجائیگی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کرکے ختم ہو گئے یا ختم ہوتے جا رہے ہیں ـــ بہت سے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

یہ تو دین کا خاصہ ہے کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسے کہ میں نے شروع میں کہا ہے ہم بھی اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں، اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہ رہے تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکیگا؟ فطرت کے قانون کے مطابق ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہوجانے کے بعد اگر اس قوم کے سامنے دین نہ ہو تو وہ دہریت اختیار کرلیتی ہے، اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں سیاست مستقل اقدار سے الگ ہوجاتی ہے اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبال کے الفاظ میں) "چنگیزیت" کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی، اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آجائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو تو اس سے دنیا جہنم میں مبتلا ہوجاتی ہے اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگہ بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے، وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ادھر کا رُخ کرے، یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تاکہ دنیا میں ایک خطہ زمین تو ایسا ہو جو خدا کی پروردگاری کا مظہر بن سکے۔"

طلوع اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن میں پرویز صاحب نے اراکین بزم ہائے طلوع اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:-

"میں نے رفیقانِ گرامی قدر! قرآن کریم کی اس روشنی کو چراغِ راہ بناتے ہوئے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد نہایت سکون و خاموشی، لیکن انتہائی التزام و استحکام کے ساتھ قرآنی فکر کو عام کئے جانا ہے۔ اس میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری کا کوئی دخل نہیں۔ ہمارے دستورِ اساسی کی ایک شق یہ ہے کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیںگے اس لئے اس تحریک کے ساتھ وابستگی سے نہ تو کوئی سیاسی مفاد حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں نمود و نمائش کی کوئی گنجائش اور شہرت و ناموری کا کوئی مقام ہے۔ یہاں تو دنیا بھر کی مخالفت کو نہایت سکون و اطمینان سے برداشت کرنا، اور لب تک ہلائے بغیر اپنی دُھن میں آگے بڑھتے چلے جانا

ہے، اس بزمِ شوق میں پروانے کی طرح جل کر مر جانا اور زبان سے اُف تک نہ کرنا ہے، دوسری طرف مفادِ عاجلہ کے جہانِ رنگ و بو سے یوں بیگانہ وار گزر جاتا ہے کہ اس کی کوئی کشش و جاذبیت آپکی دامنگیر نہ ہو۔"

یہ ہیں قرآنی حقائق پر استوار اس تنظیم کے مقاصد اور یہ ہے وہ مخصوص اور متعین طریق کار (ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب) جسے اس تحریک نے اپنے روزِ اوّل سے اختیار کر رکھا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ اس قسم کی تحریک آپکے تعاون کی مستحق ہے یا نہیں۔ والسلام!

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

ہر شخص اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے

لیکن — اُسے جواب کہیں سے نہیں ملتا

اسکا جواب ملیگا — ایک تازہ تصنیف

جہانِ فردا

سے جس میں موت، قبر، برزخ، حشر، نشر، قیامت، اعمال نامہ، جہنم، جنت وغیرہ کی تفصیلات درج ہیں!

جلد حاصل کیجئے۔ ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

قیمت: (اعلیٰ ایڈیشن) دس روپے، (جیبی ایڈیشن) چھ روپے

ملنے کا پتہ:

ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور * مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار۔ لاہور

چھ نکات ——— پانچ سال پہلے

[مارچ ۱۹۶۶ء میں شیخ مجیب الرحمٰن اپنا وہ فارمولا ملک کے سامنے لائے جو ان کے جذبۂ علیحدگی پسندی کا غماز بلکہ عکاس تھا۔ طلوعِ اسلام نے اپنے مارچ ۱۹۶۶ء کی اشاعت کے لمعات میں اس پر جو تنقید کی تھی اس کی اہمیت آج اور بھی نمایاں طور پر سامنے آسکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ان لمعات کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ یہ آپ کی گہری سوچ اور توجہ کے محتاج ہیں۔]

(۱)

پاکستان کی فضا میں آئے دن نئے نئے سیاسی نعرے اور صدائیں گونجتی سنائی دیتی ہیں، مختلف سیاسی پلیٹ فارموں سے نئے نئے مطالبات منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔ یہ سب نعرے عوام کی نمائندگی کے دعوے کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کا تجزیہ کریں اور ان کے پسِ منظر پر نگاہ ڈالیں، تو ان میں سے اکثر و بیشتر صداؤں کا اصل مقصد سیاسی مفاد پرستیوں اور حصولِ اقتدار کی کشمکش سے زیادہ نہیں ہوتا۔ کہیں پنجوتنوں اور پنجابیوں کے حقوق کے تحفظ کے نام پر، کہیں سندھیوں کے جداگانہ قومی تشخص کے نقاب میں، کہیں بنگالیوں کے حق خود ارادیت کی خاطر ——— آپ دیکھیں گے کہ جس سیاسی طالع آزما کو اپنی ہوسِ اقتدار کے لئے کوئی نعرہ زیادہ کارآمد اور سازگار نظر آتا ہے، وہ اسے لے کر میدان میں چلا آرہا ہے اور اس کا قطعاً احساس نہیں کہ اس سے ملکی سالمیت پر کیا اثر پڑے گا۔ اس سے قوم کی وحدت و اتحاد کے تقاضے کیونکر زیر و زبر ہو کر رہ جائیں گے۔ اس سے حیاتِ ملی میں کس قدر انتشار رونما ہوگا۔ کوئی قطعاً نہیں سوچتا کہ یہ نعرے بازی اور ہنگامہ آرائی اس مملکت کو کس انجام سے دوچار کرے گی جس کے حصول و قیام کے لئے اس قدر عظیم جنگ لڑی گئی اور جس کے دفاع و تحفظ کے لئے سینکڑوں ماؤں کے نورِ نظر قربان ہوئے اور ہزاروں انسانوں کو بیش بہا قربانیاں دینی پڑیں۔

اسی نوعیت کا ایک نعرہ ابھی ابھی ملک میں گونجتا سنائی دیا ہے۔ یہ شر انگیز نعرہ مشرقی پاکستان کی خود مختاری کے نام پر بلند ہوا اور مشرقی پاکستان ہی کے ایک طالع آزما (شیخ مجیب الرحمٰن صاحب) اس کے محرک تھے۔ انہوں

نے حزب اختلاف کی نیشنل کانفرنس لاہور کی مجلس مضامین (SUBJECT COMMITTEE) میں اس سلسلے میں جو تجویز پیش کی اس کے مسودے کا عکس مذکورہ کانفرنس کے خاتمہ پر بعض اخبارات میں شائع ہوا۔ اس کے مطابق ان صاحب کا مطالبہ یہ تھا کہ

> ملک کا آئینی ڈھانچہ تبدیل کر کے ایسے وفاق کی بنیاد رکھی جائے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کی دو خود مختار ریاستوں پر مشتمل ہو۔ مرکزی حکومت کو صرف دفاع اور امورِ خارجہ سے تعلق ہو۔ باقی تمام معاملات میں دونوں ریاستیں کاملاً خود مختار ہوں۔
>
> کرنسی کے بارے میں دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ یا تو دونوں ریاستوں میں جدا جدا کرنسی رائج ہو یا پھر ملک بھر کے لئے ایک ہی کرنسی ہو۔ اس صورت میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان میں سرمایہ منتقل کرنے پر مؤثر آئینی پابندیاں عاید ہوں۔ علاوہ بریں مشرقی پاکستان کے لئے بینکنگ ریزرو کا الگ انتظام ہو یا مشرقی پاکستان کے لئے جداگانہ مالیاتی پالیسی اختیار کی جائے۔

(کوہستان - ۱۰ فروری ۱۹۶۶ء)

یہ شیخ مجیب الرحمٰن وہی صاحب ہیں جنہوں نے گزشتہ انتخابات کے زمانے میں یہ اعلان فرمایا تھا کہ اگر انکی پارٹی کو برسرِ اقتدار آنے کا موقع مل گیا تو وہ بھارت سے مشترکہ دفاع کا معاہدہ کریں گے۔ پاکستان جس صورتِ حال کا سامنا کر رہا ہے اور اس صورتِ حال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لئے ہماری قومی صفوں میں جس قدر وحدت و اتحاد کی ضرورت ہے اس کی روشنی میں اندازہ لگا لیجئے کہ علیحدگی کا یہ رجحان ہمیں کس تباہی سے دوچار کر سکتا ہے اور یہ ذہنیت قومی منافرت کے کس جہنم کو دعوت دے رہی ہے۔ اس قسم کے نعرے پہلے بھی کئی بار بلند ہوتے رہے اور علیحدگی کا یہ رجحان اس سے قبل بھی قومی زندگی میں فتنہ و شر کی چنگاریاں بکھیرتا رہا۔ کوئی تیرہ چودہ برس ادھر کا ذکر ہے کہ مشرقی پاکستان میں یہ تحریک پیدا کی گئی کہ اس صوبے کو زیادہ سے زیادہ اختیارات ملنے چاہئیں۔ اس تحریک نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی کہ اور تو اور خود ہمیں بھی مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ ملک کی سالمیت کی خاطر اس تجویز کو مان لیا جائے۔ لیکن بعد کے حالات سے جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس تحریک کے پس پردہ کیا کیا محرکات کارفرما تھے تو ہم نے ملک کو اس سے متنبہ کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ مرکز کو ہر حیثیت پر مضبوط رکھنے کے لئے وحدانی طرزِ حکومت اختیار کیا جائے اور صوبوں میں ذہنی تربیت کی ایسی مؤثر صورت پیدا کی جائے جو اسلامی آئیڈیالوجی کی قدرِ مشترک سے سب کے دلوں کو جوڑ دے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں آئینی کمیشن کے سوالنامہ کے سلسلے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بھی ہم نے لکھا تھا کہ نئے آئین کے تحت ملک میں وحدانی طرزِ حکومت قائم کیا جائے اور اس

کے لئے ۔۔۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں صرف ایک ایک گورنر ہو اور گورنر کی مجلس مشاورت (کابینہ) ہو الگ پارلیمانیں نہ ہوں۔ (طلوعِ اسلام۔ مئی۔ جون ۱۹۶۰ء)

لیکن افسوس کہ نئے آئین کی ترتیب کے سلسلے میں ہماری اس تجویز کو قابلِ قبول نہ سمجھا گیا اور وحدانی طرزِ حکومت کو نظر انداز کر کے وہ صورت برقرار رکھی گئی جو صوبائی عصبیت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو وقتاً فوقتاً بھڑک اٹھنے کے مواقع فراہم کرتی رہے۔ چنانچہ ہم سب نے دیکھ لیا کہ موجودہ طرزِ حکومت میں یہ خطرہ برابر موجود ہے اور موجود رہے گا کہ کوئی طالع آزما جب جی چاہے اس خاکستر کو ہوا دے اور ان چنگاریوں کو بھڑکا کر ملک کی سالمیت کو خطرے میں ڈال دے۔ ہمارے نزدیک ملک کو اس فتنہ و شر کے ہنگاموں سے بچانے کا سیاسی حل وحدانی طرزِ حکومت کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرزِ حکومت کے تحت صوبائی اسمبلیوں کا وجود باقی نہیں رہتا، اور مرکز قانون سازی کا سرچشمہ قرار پا جاتا ہے۔ یہ صورت علیحدگی کے رجحان کو سیاسی طور پر ختم کر سکتی ہے اور اسی سے ان شر انگیزیوں کے سر اٹھانے کے امکانات باقی نہیں رہتے۔

لیکن یہ اس صورتِ حال کا سیاسی اور ہنگامی حل ہے، مستقل اور قطعی حل نہیں۔ اس کا مستقل حل، وحدتِ مقصد کے ذریعے پیدا ہو سکتا ہے اور ہمیں افسوس سے یہ عرض کرنا پڑے گا کہ اس وقت تک جو سیاسی طوفان اٹھتے رہے اور مفاد پرستیوں نے ہنگاموں کو جو قدم قدم پر جنم دیا انہوں نے قوم کو وحدتِ مقصد کی نعمت سے بے نصیب کر دیا ہے۔ ہم نے جب تحریک پاکستان کے نام پر اپنے منظم اور طاقت ور دشمن کے مقابل حق خود ارادیت کے حصول کی جنگ لڑی تو اس معرکہ آرائی کے فی تحاشہ انجام کا باعث وحدتِ مقصد کے سوا کچھ نہ تھا۔ رنگون سے لیکر پشاور تک ہماری ملت کے کروڑوں افراد کے سامنے ایک مقصد اور ایک منزل تھی۔ اس جنگ میں کوئی بھی بنگالی، پنجابی، سندھی اور پٹھان کی حیثیت سے شریک نہیں تھا۔ سب ایک ملتِ واحدہ کے افراد کی حیثیت سے ایک بنیان مرصوص کی سی وحدت میں ڈھل گئے تھے۔ انہوں نے یہ ملک ایک قوم کی حیثیت سے اور ایک قوم کے نام پر حاصل کیا اور اس وقت یہ کسی کے تصور بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اس مملکت میں پنجابی، بنگالی، سرحدی اور سندھی کے نام قومی تشخص کی حیثیت سے ابھریں گے۔

آج بھی مملکتِ پاکستان کی سالمیت اور بقاء و استحکام کا جذبہ محرکہ وحدتِ مقصد کے سوا اور کوئی نہیں بن سکتا۔ جب ہم نے اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کی وجہ جواز کے طور پر اپنے آپ کو ایک قوم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا تو اس ایک قوم کے دعوے کی بنا سے اشتراک وطن، صوبے، رنگ یا نسل کا کوئی تصور نہیں تھا بلکہ یہ بنا سے اشتراک اسلام اور صرف اسلام تھا۔ یہ دعویٰ تھا کہ چونکہ ہم سب مسلمان ہیں، اس لئے ہم ایک قوم ہیں۔ شیخ

مجیب الرحمٰن یا اس قسم کے دیگر علیحدگی پسند دوسرے لوگ یہ کہیں گے کہ بحمد اللہ ہم اب بھی مسلمان ہیں: ہم سب ایک ہی کلمہ پڑھتے ہیں اور جب تک ہم ایک ہی کلمہ پر ایمان رکھتے ہیں' ہمارے مسلمان اور ایک قوم ہونے میں شک کیا ہے؟ لیکن اتنا کہنے سے اسلام کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ایسا کہنے سے ہم حقیقی طور پر ایک قوم نہیں بن جاتے۔ دین و ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کی صورت میں متشکل ہونے کا مقصد یہ ہے کہ جن قرآنی اصول و اقدار پر ہم ایمان رکھتے ہیں انہیں پاکستان میں ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے عملاً متشکل کیا جائے۔ قرآن کریم کی تعلیمات اور منشاء و مقصود ایک زندہ حقیقت بن کر ہماری اجتماعی زندگی میں محسوس و مشہود طور پر رائج ہو۔ یہی وہ وحدتِ مقصد ہے جو ہمیں صحیح معنوں میں ایک قوم بنا سکتی ہے اور جب یہ صورتِ حال ہمارے معاشرے میں عملاً متشکل ہو جائے تو افرادِ ملّت میں کوئی دوسری بنائے اشتراک باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ وحدتِ مقصد صوبائی اور نسلی عصبیتوں کا وجود تک ختم کر دیتی ہے۔ اس ایک مرکزِ فکر و عمل کو اپنا لینے کے بعد پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد کے لات و منات چکنا چور ہو کر رہ جاتے ہیں اور کوئی مجیب الرحمٰن ملّت کی اس ناقابلِ تقسیم وحدت کو صوبائی خود مختاری کے نعروں سے تفریق و تشتت کے شرک سے متاثر نہیں کر سکتا۔ کارفرمایانِ مملکت کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ قومی فکر و عمل میں ان نظریات و تصورات کی عملی کیفیات راسخ کر دیں جن کی بدولت مسلم قوم کا وجود حقیقی متشکل ہوتا ہے۔

اس وحدتِ مقصد سے محرومی اور بے نصیبی کا نتیجہ ہے کہ آج اس مملکت کا کوئی فرد نہ ملک کے مفاد کو اپنا مفاد سمجھتا ہے اور نہ اس کے نقصان کو اپنا نقصان۔ جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلاں اقدام سے ملک کو نقصان پہنچے گا تو ملک کے عوام اس کا کوئی گہرا اثر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کا کیا نقصان ہو گا۔ نقصان ہو گا تو ان دو تین سو خاندانوں کا' جو ملک کی دولت سمیٹ سمیٹ کر کروڑپتی اور ارب پتی بن بیٹھے ہیں۔ اور اگر عوام سے یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کام کرنے سے ملک کو فائدہ پہنچے گا تو وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں بھلا اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر کوئی فائدہ پہنچے گا تو ان کو جو اپنے کاروبار اور ملوں کے زور پر ایک ایک روپے سے دس دس پیدا کر رہے ہیں۔ سوچیے کہ یہ ذہنی ردعمل جو افرادِ مملکت میں پیدا ہو چکا ہے، کس ہولناک رجحان کی نشاندہی کر رہا ہے۔ جب ایک مملکت میں صورت یہ پیدا کر دی گئی ہو کہ چند سو خاندانوں کو معاشی اجارہ داری حاصل ہو' اور باقی کروڑوں' ان کی حلبِ زر کے ہاتھوں ضروریاتِ زندگی تک سے محروم ہوتے جا رہے ہوں تو محض ایک کلمہ پر زبانی ایمان رکھنے سے وہ کیونکر وحدتِ مقصد اور وحدتِ ملّت کی سلکِ تنظیم میں پروئے جا سکتے ہیں' انہیں کیونکر ایک مشترک مفاد اور مشترک مقصد پر لایا جا سکتا ہے۔ وہ کیونکر صحیح معنوں میں ایک قوم کے افراد قرار پا سکتے ہیں۔

آج پاکستان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اس کے افرادِ مملکت میں نہ نظری طور پر وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ عملی طور پر ان کی زندگی میں قرآن کا وہ معاشی نظام بروئے کار لایا گیا جو معاشی مساوات

کی سطح پر لاکر انہیں اسلامی اخوت کے سچے جذبے سے سرشار کر سکے ۔ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ" کے زبانی اقرار سے تو افراد میں بنیادی اشتراک پیدا نہیں ہو سکتا۔ اتنا کہہ دینے سے تو وہ بھائی بھائی اور ایک ملت کے افراد نہیں بن سکتے ۔ یہ کچھ اگر ممکن ہوگا تو صرف اس تصوریت (IDEALOGY) کو افراد مملکت کی زندگی میں عملاً متشکل کرنے سے جس پر ہم زبانی ایمان رکھنے کے مدعی ہیں ۔

لا الہ الا اللہ تو ایک فارمولا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی فارمولا کو زبانی دہراتے رہنے سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ اسے عمل میں لانے ہی سے سامنے آسکتا ہے۔ لہذا جب تک اسلامک آئیڈیالوجی ایک جیتے جاگتے نظام کی صورت میں متشکل نہیں ہوگی' لا الہ الا اللہ کے الفاظ اپنے حقیقی نظام توحید کی شکل اختیار نہیں کریں گے۔ جب تک دین و ایمان کی یہ قدر مشترک نیاس مجاز میں جلوہ گر نہیں ہوگی، افرادِ ملت میں وہ سچی وحدت اور اتحاد کبھی قائم نہیں ہوگا جو پاکستان کی سالمیت کی ضمانت قرار پا سکے اور صوبائی تعصبات اور علاقائی خودمختاری کے فتنہ و شر کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اشد ضروری ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اس طرح بدلا جائے کہ ہماری آنے والی نسلیں نقطہ مسلمان کی حیثیت سے سامنے آئیں اور ان کی اس حیثیت کا جذبہ اُن کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے ۔

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار کی صبح ۔۔۔ ۹ بجے

بمقام

۲۵/بی ۔۔۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

راولپنڈی میں

(بذریعہ ٹیپ)

بروز جمعہ ۔۔۔ بوقت ۴ بجے شام

بمقام "الکوثر" مری روڈ

کراچی میں

(بذریعہ ٹیپ)

بروز اتوار ۔ بوقت ۹½ بجے صبح

بمقام ۔ دفتر بزم طلوع اسلام ۔ فردوس کالونی پہلی چورنگی ۔ ناظم آباد ۔ کراچی